جولائی ۱۹۹۱ء

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

حرفِ اوّل	عاکف سعید	۲
سورۂ یوسف کی ابتدائی تین آیات (نشری تقریر)	ڈاکٹر اسرار احمد	۳
"علماء امّتی" کا شرعی مفہوم	مولانا اخلاق حسین قاسمی	۸
امام نوویؒ (کاروانِ حدیث: ۱۶)	عبدالرشید عراقی	۱۸
عربی زبان کی اہمیّت	ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک	۲۳
حکمتِ اقبال (۳۳)	ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم	۳۴
لغات و اعرابِ قرآن (۲۵)	پروفیسر حافظ احمد یار	۴۱
اسلامی معیشت میں سادگی کی اہمیت (۳)	ڈاکٹر امین اللہ وشیر	۵۱
تحریک رجوع الی القرآن: اجمالی تعارف اور دعوت شمولیت	سراج الحق سید	۶۱

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجیے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
صرف -/۱۱ روپے (سستا ایڈیشن -/۶ روپے)

قریبی بک سٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۰ | ذوالحجہ ۱۴۱۱ھ - جولائی ۱۹۹۱ء | شمارہ: ۷

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بیکری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۴۰/- روپے، فی شمارہ ۴/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

ماہ اپریل میں مرکزی انجمن خدام القرآن کا انیسواں سالانہ اجتماع قرآن اکیڈمی لاہور میں منعقد ہُوا تھا۔ اس اجتماع کی رُوداد اور اُس موقع پر پیش کی جانے والی سالانہ رپورٹ اِس سے قبل 'حکمتِ قرآن' میں شائع کی جا چکی ہے — اور اس حوالے سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا تعارف اور اس کی سرگرمیوں کا ایک اجمالی خاکہ قارئین کے سامنے آ چکا ہے — ان تمام چیزوں کی اشاعت سے جہاں یہ بات پیشِ نظر ہے کہ رفقاء و احباب اور قارئینِ کرام کو 'رجوع الی القرآن' کے میدان میں مرکزی انجمن کی پیش رفت سے آگاہی حاصل ہوتی رہے، وہیں اس سے مقصود یہ بھی ہے کہ احباب کو 'تعلّم و تعلیم قرآن' کے اس مبارک کام میں شرکت و معاونت پر آمادہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی نااہلی اور بے ذوقی کے باعث اِس میدان میں خواہ زیادہ پیش رفت نہ کر پائیں، اپنی جگہ یہ کام نہایت عظیم اور مبارک ہے، اور فی الواقع کرنے کا کام ہے — باصلاحیت اور قابل لوگوں کے تعاون سے ہی اِس کام کی رفتار اور کوالٹی میں بہتری ممکن ہے — ہر شخص کو اپنی جگہ یہ سوچنا چاہیئے کہ اس مبارک کام کے ساتھ وہ خود کتنا کچھ تعاون کر رہا ہے اور اپنی صلاحیتوں اور اوقات کا کتنا حصّہ اُس نے اِس کام کے لیے مختص کیا ہے۔

اِس ضمن میں مرکزی انجمن کے ناظمِ اعلیٰ کی جانب سے ایک مضمون زیرِ نظر شمارے میں شامل ہے جس میں انجمن کے پیشِ نظر علمی منصوبوں کا اجمالی ذکر بھی ہے، اور دعوتِ عمل بھی!

نشری تقریر

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ یوسف کی پہلی تین آیات

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○
الٓرٰ تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ ○ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا
لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ○ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْکَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ
بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِہٖ
لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ○ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم

"الف لام را، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو بالکل واضح ہے۔ ہم نے اسے قرآنِ عربی بنا کر اُتارا تاکہ تم اچھی طرح سمجھ سکو۔ (اے نبی!) ہم آپ کو ایک بہترین سرگزشت سُناتے ہیں اس قرآن کے ذریعے جو ہم نے آپ پر وحی کیا ہے۔ یقیناً اس سے قبل آپ اس سے ناواقف تھے!"

سورۂ یوسف کی ابتدائی تین آیات اور ان کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ قرآن حکیم میں دو ہی سورتیں ایسی ہیں جو از اوّل تا آخر کسی ایک ہی نبی یا رسول کے حالات پر مشتمل ہوں۔ ایک سورۂ یوسف اور دوسری سورۂ طٰہٰ۔ اور ان دونوں کے مابین ایک عجیب تعلق یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں اُن کا مصر سے نکلنا ہوا۔ سورۂ یوسف میں از ابتدا تا انتہا حضرت یوسف علیہ السّلام کے حالات و واقعات کا بیان ہے اور سورۂ طٰہٰ میں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے حالات و کوائف بیان ہوتے ہیں!

مصحف میں سورۂ یوسف سے قبل دو سورتوں کا آغاز الف لام را کے حروفِ مقطعات

سے ہوا ہے، یعنی سورۂ یونس اور سورۂ ہُود ـــــ تینوں سورتوں میں حروفِ مقطعات کے فوراً بعد قرآنِ حکیم کی عظمت اور جلالتِ شان کا ذکر ہے۔ پہلی دونوں سورتوں میں، جن کے مابین نسبتِ زوجیّت بتمام وکمال موجود ہے، قرآن کے حاملِ حکمت ہونے کا بیان ہے، اگرچہ اسلوبِ بیان دونوں جگہ جدا ہے ـــــ گویا ع "اِک پھُول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!" والا معاملہ ہے۔ لیکن سورۂ یوسف میں قرآن کے ایک کتابِ مُبین ہونے کو واضح کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ، یہ وہ کتاب ہے جو اپنے مفہوم ومدلول کی جانب پُوری وضاحت اور کمالِ قطعیّت وحتمیت کے ساتھ رہنمائی کرتی ہے۔ اِس کا سبب غالباً یہی ہے کہ اِس سُورت میں ایک طویل قصہ بیان ہو رہا ہے، اور اگرچہ قرآنِ حکیم نے اِس قصّے میں بھی جابجا حکمت کے موتی بکھیر دیئے ہیں، لیکن قصّے کا اصل وصفِ مطلوب یہ ہوتا ہے کہ اس کے بیان میں اینچ پینچ یا ہیر پھیر نہ ہو۔ بلکہ واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ وہ ایک مسلسل لڑی کی کڑیاں معلوم ہوں۔ اور جہاں پیرایۂ بیان ایسا ہو کہ دلچسپی برقرار رہے اور سامع یا قاری کی پوری توجہ اس پر مرتکز رہے وہاں بات مربوط ومسلسل بھی ہو اور مفید ونتیجہ خیز بھی ـــــ یہی سبب ہے کہ تیسری آیت میں حضرت یوسف علیہ السّلام کے قصّے کو: "اَحۡسَنَ الۡقَصَصِ" قرار دیا گیا ہے۔ "اَحۡسَنَ الۡقِصَصِ" نہیں فرمایا گیا۔ 'قِصَص' قِصّہ کی جمع ہوتی اور 'اَحۡسَنَ الۡقِصَصِ' کے معنی ہوتے بہترین قصّہ ـــــ جبکہ 'قَصَص' مصدر ہے جس کے معنی ہیں بیان کرنا، اور اگرچہ بلاشبہ یہاں یہ مصدر بمعنی اسم آیا ہے اور مراد اس سے قِصّہ ہی ہے، لیکن مصدر کے استعمال سے اشارہ ہو گیا کہ اس میں اصل 'حُسن' بیان کرنے والے کے پیرایۂ بیان کا ہے۔ ورنہ اچھے سے اچھے قصّے کو بھی بھونڈے طرز پر بیان کر کے اُس کے سارے حُسن کو زائل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں آغاز ہی میں قرآن کے 'مبین' ہونے پر زور دیا گیا۔

حُروفِ مقطعات کے بارے میں صحیح رائے یہی ہے کہ ان کے معنی ومفہوم کا قطعی وحتمی علم سوائے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی کو نہیں ہے۔ اِس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ، نعوذ باللہ من ذٰلک، یہ بے معنی ہیں۔ یقیناً یہ معنی کے حامل بھی ہیں اور حکمت کے بھی۔ چنانچہ بہت سے حضرات نے اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی کاوش کی مناسبت سے اُن کے معانی وحِکَم کی جانب اشارے کیے ہیں۔ جیسے کہ خود صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عبداللہ ابن

عباس رضؓ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک حروفِ مقطعات پورے پورے جملوں کا مخفف ہیں۔ چنانچہ "الف لام را" مخفّف ہے: "اَنَا اللّٰہُ اَرٰی" کا (یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں!) واللہ اعلم۔ اسی طرح حال ہی میں ایک مصری محقق رشاد خلیفہ نے کمپیوٹر کے ذریعے اُن کی عددی معنویت کا ایک کھوج نکالا ہے۔ لیکن یہ تمام باتیں اپنی اپنی جگہ احتمالِ صحت کے باوصف محض ظن و قیاس پر مبنی ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ ان کے حقیقی معنوں کا علم سوائے اللہ اور اُس کے رسول کے اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔

دوسری آیت میں خطاب اہلِ عرب کی جانب ہے، کہ تم پر ہمارا یہ عظیم احسان ہے کہ ہم نے اپنے آخری کلام اور ابدی ہدایتِ کاملہ کو تمہاری زبان میں نازل فرمایا، تاکہ تمہیں اس کے کما حقّہٗ فہم میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ اور اس کا نزول تمہارے دل و دماغ پر بلا روک ٹوک ہو۔ اور یہ تمہارے باطن میں اس طرح سرایت کر جائے اور تمہارے وجود میں اس طرح رچ بس جائے کہ تم ع "قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن!" کے مصداق اس کی تعلیمات کا پیکرِ مجسّم بن جاؤ۔ اور اس طرح اپنے وجود سے ایک عالمی اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکو، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود   جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

یہ آیت مبارکہ بڑے واشگاف الفاظ میں اعلان کر رہی ہے کہ قرآن مجید محلِّ تعقّل و تفکّر بھی ہے اور محلِّ تدبّر بھی۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے الفاظ بجائے خود بھی معجزہ ہیں اور اُن کا بغیر سمجھے محض پڑھ لینا بھی فائدے سے بالکل خالی نہیں ہے، اور اس کا صوتی آہنگ بھی معجز نما ہے، اور اس سے بالکل غیر شعوری طور پر بھی روح کو غذا ملتی ہے لیکن اِس کا اصل مقصدِ نزول تعقّل و تفکّر اور تفہّم و تدبّر ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا کیا ان کے دلوں پر تالے پڑ چکے ہیں!) —— اور بفحوائے حدیثِ نبویؐ: يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ فِيْ اٰنَاۗءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ("اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ نہ بنا لینا، بلکہ اسے پڑھتے رہنا جیسے کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔ رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی، اور اسے پھیلانا اور عام کرتے رہنا، اور اسے خوش الحانی سے پڑھ کر حظ اٹھاتے رہنا، اور اس پر تدبّر کرتے رہنا تاکہ تم فلاح پاؤ!) —— اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان تمام احکام پر عمل پیرا

ہونے کی توفیق عطا فرمائے! آمین ثم آمین۔

تیسری آیت تمہید ہے حضرت یوسف علیہ السّلام کے قصّے کی، جسے یہاں "احسن القصص" سے تعبیر فرمایا گیا۔ اِس لیے کہ اِس میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تشریعی و تکوینی کے راز کھلتے ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ یہ دُنیا نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے، نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل۔ اس کا ایک خالق و مالک ہے جس نے اِسے بنا کر یونہی اندھیر نگری چوپٹ راج کی طرح بگٹٹ نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ وہ اس کا حاکم بھی ہے اور مُدبّر بھی ـــــ اور اس تدبیر میں اُس کے ارادہ و اختیار کے ایسے ایسے مظہر سامنے آتے ہیں کہ عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں، اور بے اختیار یہ الفاظ زبان پر آجاتے ہیں کہ: وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (اللہ اپنے ارادے اور مشیت کی تکمیل پر پوری قدرت رکھتا ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا فہم و ادراک حاصل نہیں!)

واضح رہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام اور اُن کے حاسد بھائیوں کی سرگزشت کے پردے میں دراصل قریش کے ان لوگوں کو سبق دیا جارہا ہے، جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مخالفت اور عداوت میں اِس حد تک پہنچ گئے تھے کہ آپؐ کے قتل کی تدبیر کر رہے تھے، کہ لے دے کر تم کیا اور تمہاری تدبیریں کیا! اصل فیصلہ اللہ کا ہے، اور وہ یہ ہے کہ: وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ (اللہ اپنے نور کا اِتمام فرما کر رہے گا، خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!) ـــــ اور جس طرح وہی بھائی جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السّلام کو چاہِ کنعان میں پھینک دیا تھا، ایک روز سرنگوں اور شرمسار ہو کر اُن کے سامنے کھڑے تھے، اِسی طرح وہ دِن دُور نہیں کہ جنہیں قتل کرنے کے مشورے تم آج کل کر رہے ہو، فتح مکّہ کے دن تم اُن کے سامنے بالکل بے بس و لاچار حالت میں کھڑے ہوگے ـــــ اور اس وقت وہ تم سے وہی الفاظ کہیں گے جو حضرت یوسف علیہ السّلام نے اپنے بھائیوں سے کہے تھے: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (الآیۃ) کہ آج کے دن میں تم سے ملامت کا کوئی لفظ بھی نہیں کہنا چاہتا ـــــ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ (الحدیث) جاؤ تم سب آزاد ہو!

آخری بات یہ فرمائی گئی کہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل کے جو حالات و واقعات اِس سورۂ مبارکہ میں اتنی وضاحت کے ساتھ بیان ہو رہے ہیں تو یہ کسی کا علمِ ذاتی ہے، نہ اِدھر اُدھر سے سُنی سنائی معلومات، بلکہ اللہ کی وحی ہے جو وہ اپنے محبوب بندے حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پر

کر رہا ہے۔ اور وہ خود بھی اس وحی سے قبل اِن حالات سے ناواقف تھے۔ اِس مقام پر "غٰفِلِیۡنَ" کا لفظ بظاہر بڑا ثقیل ہے اور آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے تذکرے میں تو واقعۃً ہر مومن کے لیے بڑا بھاری ہے لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت مضمر ہے۔ اور قرآن کا یہی وہ طرزِ بیان ہے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مبارک اور مقدّس شخصیت کے گرد ایک حصار بن گیا ہے جس کے ذریعے آپ کو وہ تحفظ حاصل ہو گیا کہ آپؐ سے انتہائی محبّت اور عقیدت کے باوجود اُمّتِ محمّدؐ علےٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام اِس غُلو سے محفوظ رہی جس میں دوسری اُمتیں مبتلا ہو گئیں۔ چنانچہ یہود نے حضرت عُزیر علیہ السّلام کو خُدا کا بیٹا قرار دے دیا، اور نصاریٰ نے تو ابنیّتِ مسیحؑ کے عقیدے کو اپنے دین کا اصل الأصول بنا ڈالا۔ ادھر بفضلہٖ تعالیٰ یہ حال ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثاروں کو تو خدا کہنے والے پیدا ہو گئے، لیکن آپؐ کی شخصیت اس سے محفوظ اور مامون و مصئون رہی۔

فَلِلّٰہِ الۡحَمۡدُ ! وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحٰبِہٖ وَسَلَّمَ

بقیہ: "علماء اُمّتی" کا شرعی مفہوم

مفتی محمد شفیع صاحب نے معارف القرآن میں اس مقام پر اتّباع بمعنی استماع پر ائمہ کا اتفاق تحریر کیا ہے۔ (جلد ۵ ص ۶۲۷)

○ ○

بقیہ: کاروانِ حدیث

۱۰ ذہبی، "تذکرۃ الحفاظ" ج ۴ ص ۲۶۳

۱۱ طاش کبریٰ زادہ، مفتاح السعادۃ، ج ۱ ص ۳۹۸

۱۲ محمد بن جعفر کتانی (م ۱۳۴۵ھ) رسالہ المستطرفہ ص ۱۲۴

۱۳ نووی، مقدمہ شرح مسلم ص ۴

۱۴ حاجی خلیفہ مصطفیٰ، کشف الظنون ج ۱ ص ۸۰-۸۱

۱۵ عبد السّلام مبارک پوری، سیرۃ البخاری ص ۴۱۵

۱۶ نواب صدیق حسن خاں، اتحاف النبلاء ص ۴۲۱۔

○ ○

"علماء امّتی" کا شرعی مفہوم

تحریر: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے علماء کو اعزاز و اکرام سے نوازتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا:

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ — "میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہیں۔"

یعنی ذمہ داری اور درجہ دونوں کے لحاظ سے — میرے بعد نبوت ختم ہو چکی، اب دین کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ میری امت کے علماء انجام دیں گے، اس لیے ان کا درجہ خدا کے ہاں بھی بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے برابر ہوگا۔

بنی اسرائیل میں تبلیغِ دین کا کام نبی کرتے تھے اور ایک ایک نبی کے نائب اس کی حیات میں بھی اور اس کے بعد بھی کثرت سے مقرر کر دیے جاتے تھے، جیسے اصلی نبی (صاحبِ وحی) حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے اور ان کے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ ان کے نائب نبی مقرر کیے گئے تھے — اسی طرح حزقیل نبی، سموئیل نبی، یسعیاہ نبی تھے — جو حضرت موسیٰؑ کے نائب کے طور پر توراۃ کی شریعت پھیلاتے تھے۔

رسولِ اکرمؐ نے دوسرے موقع پر فرمایا:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ — حضراتِ انبیاء کے وارث علماء ہوتے ہیں۔

کیونکہ انبیاءؑ کا حقیقی ورثہ علم ہے، دولت نہیں۔

سوال یہ ہے کہ ان احادیث میں علماء کا لفظ کیا مفہوم رکھتا ہے؟ اگر علماء کا مفہوم وہی ہے جو آج ہمارے عرف و محاورہ میں استعمال ہوتا ہے، یعنی دین کے پڑھنے

پڑھانے والے لوگ، تو پھر اس فضیلت سے صوفیائے ربّانی کی جماعت نکل جاتی ہے، کیونکہ صوفیاء وہ حضرات ہیں جو دینی تربیت و تزکیہ کے ذریعہ دین پھیلاتے ہیں حالانکہ جس طرح دینی تعلیم رسولِ پاکؐ کے فرائضِ نبوّت کا ایک حصّہ تھا، اسی طرح دینی تربیت بھی آپؐ کے پیغمبرانہ مشن کا ایک حصّہ تھا۔ قرآن کریم نے کہا:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۔ "وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم انہیں کتابِ الٰہی اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور (اس کتاب کے مطابق) ان کی (ذہنی اور عملی) تربیت کرتے ہیں۔"

اب ہمیں لفظِ علماء کا مفہوم متعیّن کرنے کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم میں علماء کا لفظ دو مقام پر آیا ہے۔ سورۃ الشعراء (۲۶، ۱۹۷) میں بنی اسرائیل کے علماء کا ذکر ہے:

اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ ۔ "کیا اہلِ مکّہ کے لیے یہ دلیل اور نشانی کافی نہیں کہ (قرآن کے نزول کی خبر کا) بنی اسرائیل کے پڑھے لکھے لوگ علم رکھتے ہیں؟"

دوسرا مقام سورۃ الفاطر (۳۵) ہے۔ وہاں فرمایا گیا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ "اللہ تعالےٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو سمجھ والے ہیں۔"

اربابِ تراجم علماء میں صرف شاہ عبدالقادر صاحب محدّث دہلویؒ وہ بزرگ ہیں جو الہامی علم کی مدد سے کتابی علم کے اسرار و رموز کھولتے ہیں اور کتابِ الٰہی کے عربی الفاظ کا شرعی اور مرادی مفہوم اردو میں بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے پہلی آیت میں علماء کا لغوی اور عام مفہوم لکھا، یعنی پڑھے لکھے لوگ، وہ لوگ جن کے پاس کتابی معلومات ہیں اور وہ لوگ کتابوں کے الفاظ اور کتابوں کی عبارت پڑھ لیتے ہیں اور لکھ لیتے ہیں لیکن شاہ صاحب

نے دوسری آیت کے ترجمہ میں علماء کے لفظ کا شرعی اصطلاحی مفہوم تحریر کیا ہے۔ پھر شاہ صاحب نے "سمجھ" کو عام اور مطلق رکھا ہے، دین کے ساتھ خاص نہیں کیا۔۔۔ یعنی دین اور دنیا دونوں کی سمجھ، دین اور دنیا دونوں کی حقیقت کا عرفان، دونوں کی گہرائی اور تہہ کا شعور۔۔۔

قرآن کریم نے دین اور دنیا دونوں پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ دنیا کے لیے کہا:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (آل عمران: ۱۹۱)

"اور وہ آسمان اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں۔"

دین کے لیے کہا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل: ۴۴)

"(اے نبی محترم!) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب ذکر نازل کی تاکہ تم ان ہدایات کی تشریح و بیان کا کام کرو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہیں تاکہ وہ لوگ ان پر غور کریں۔"

غور و فکر یہ کہ یہ دنیا اور اس کی نعمتیں خدا کی طرف سے امانت ہیں، ان کا شکر ادا کرنا ضروری ہے اور اس معبودِ برحق اور خالق کے شکر ادا کرنے کا طریقہ ہی مذہب کہلاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ خشیّتِ الٰہی (جس کا تعلّق قلبی کیفیت سے ہے) انہی لوگوں کے اندر ہوتی ہے جو دین کا فہم اور شعور رکھتے ہیں اور دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں۔۔۔ قرآن و حدیث کے جاننے والوں (جانکاروں) میں عیسائی دنیا کے اندر کثرت سے لوگ موجود ہیں جنہیں اصطلاح میں مستشرق کہا جاتا ہے۔ وہ جانکار ہیں، لیکن سمجھدار نہیں۔ ان کے پاس قرآن و حدیث کے ظاہر کا علم ہے۔ کتابی علم ہے۔ ان کے پاس قرآن و حدیث اور شریعت کے باطن اور اس کی روح کا شعور و فہم حاصل نہیں۔ اس لیے وہ خشیتِ الٰہی سے خالی ہیں۔

قرآن کریم نے علم کے ساتھ دو لفظ اور بھی استعمال کیے ہیں۔ ایک لفظ بصیرت،

دوسرا لفظ حکمت — سورۃ البقرۃ (۲۶۹) میں کہا گیا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝	"اور جسے سمجھ دی گئی اسے خیرِ کثیر عطا کی گئی۔"

سورۂ یوسف (۱۰۸) میں کہا گیا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ، عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ	"(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) تم یہ اعلان کر دو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اور میرے پیرو اس کی طرف سمجھ بوجھ کر تمہیں بلاتے ہیں۔"

ابتداءِ اسلام میں علمِ ظاہر اور علمِ باطن دونوں ایک ہی شخصیت میں جمع تھے اس لیے اصحابِ درس اصحابِ اخلاق — معلّم اور مزکّی — دونوں کے لیے علماء کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس امت کے امام و ہادی کے مشن (کارِ نبوّت) کے دونوں جزو مقرّر کیے ہیں:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ۔	"وہ نبیؐ، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے ہیں۔"

رسولِ اکرم صلی اللہ کی براہِ راست تعلیم و تربیت نے علماءِ کاملین پیدا کیے جو بیک وقت تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا فرض ادا کرتے تھے۔ پھر بعد کے عہد میں تقسیمِ کار کے تحت علماءِ ظاہر اور علماءِ باطن کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ ایک جماعت نے کتاب و سنّت کی تعلیم و تدریس کا میدان سنبھالا۔ یہ محدّث، فقیہ اور متکلّم و قاضی کہلائے اور ایک جماعت نے اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہ صوفیائے ربانی اور مشائخ کہلائے۔ عُرفِ عام میں علماء اور اہلِ علم کا لقب محدّثین و فقہاء کے ساتھ خاص ہو گیا۔ اور اخلاقی معلّمین کے لیے صوفیاء اور اہلِ حقیقت کی اصطلاح قرار پا گئی۔

کارِ نبوّت کے دو اجزاء — تعلیم، تربیت

نادان یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت اور طریقت دو متضاد اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس اور تربیت و تزکیہ دونوں کارِ نبوت کے جزو ہیں۔ علماء اور صوفیاء کے دائروں کی تقسیم آپس کے جھگڑے کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی بلکہ جب دعوت و تبلیغ کا کام وسیع ہوا تو تقسیمِ کار کے تحت اپنے اپنے ذاتی ذوق کے مطابق علماء اور صوفیاء الگ الگ بیٹھ گئے اور مدرسہ اور خانقاہ کے دو میدانِ عمل وجود میں آ گئے۔

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کی قرآنی تعبیر

قرآنی تعبیر کے مطابق اس علم کو علمِ باطن کہا جا سکتا ہے۔ قرآن نے منکرینِ حق کے متعلق کہا:

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ (الروم: ۷)

"یہ لوگ دنیا کے ظاہر کا علم رکھتے ہیں اور آخرت (یعنی اس کے انجام اور اس کی حقیقت) سے بے خبر ہیں۔"

ظاہر کے مقابلہ میں باطن کا لفظ آتا ہے۔ شاہ صاحب نے ظاہرًا کا ترجمہ "اوپر اوپر" کیا ہے۔ یعنی یہ منکرین دنیا کی زندگی کی اوپر اوپر کی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ اگر اندر کی باتوں کا انہیں علم ہوتا تو یہ آخرت پر ایمان لے آتے۔

یہ حقیقت کھلی ہوئی ہے کہ انسان دنیا سے آخرت کی طرف جاتا ہے۔ ظاہر سے باطن کی طرف پہنچتا ہے، اس لیے جہاں باطن کا علم ہوگا وہاں ظاہر کا علم بھی ہوگا — لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں ظاہر کا علم ہو، وہاں باطن کا علم بھی ہو۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنے پڑھانے والا، اس کے الفاظ کا مطالعہ کرنے والا ضروری نہیں کہ اس کے معانی و مطالب کا علم بھی ہو، لیکن قرآن کے معانی (باطن) کا عالم

(فقیہہ) اس کے الفاظ و عبارت کا جاننے والا ضرور ہوگا۔ عبارت والفاظ ہی سے معانی کی طرف پہنچ ہوسکتی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ شریعت کے بعد ہی طریقت کی طرف پہنچ ہوتی ہے۔ پہلے شریعت اور اس کے بعد طریقت ـــــ طریقت اور تصوّف کے معنی ہیں شریعت کے آسرار و رموز اور شریعت کے اصلی مقصد (اخلاقی حسن و جمال) کا علم حاصل ہونا، چنانچہ اب بات صاف ہوگئی کہ قرآن و حدیث میں علماء کے اصطلاحی معنی علماءِ کاملین ـــ ظاہر اور باطن دونوں کے عالِم مراد ہیں۔ ظاہر کے عالِم اصحابِ تدریس و تعلیم اور باطن کے عالِم مشائخ اور صوفیاء ہیں۔

علمِ باطن اور علمِ ظاہر میں ٹکراؤ

ظاہر اور باطن کے مندرجہ بالا مفہوم سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ اور تضاد نہیں ہے۔ ایک طبقہ علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلافِ ذوق اور تقسیمِ کار کی ذمے داری کو سمجھے بغیر یہ کہتا ہے کہ کوئی معلّمِ کتاب و سنّت صوفی نہیں ہوسکتا اور جو حضرات اصلاحِ اخلاق اور روحانی ترقی کا کام کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کتاب و سنّت کے علم سے تہی دامن ہیں۔

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان جو تعلق ہے اسے سیّد علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش لاہوری) نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> "علمِ ظاہر میں لوگوں کے ساتھ معاملات کی درستگی اور علمِ باطن میں نیّت کا صحیح رکھنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسرے کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ ظاہر حال باطنی حقیقت کے بغیر نفاق ہے۔ اسی طرح باطن ظاہر کے بغیر زندقہ ہے۔ ظاہر شریعت باطن کے بغیر ناقص ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوس ہے۔" (ص ۲۷)

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی جانب

غلو اور تشدد رونما ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ باطن کا جوش اور محبت و عقیدت کی افراط انسان کو بے ساختہ اپنے محبوب کے قدموں میں جھکا دیتی ہے۔ اسے قدم بوسی اور دست بوسی کہا جاتا ہے۔ علمِ ظاہر اور علمِ فقہ کا مسئلہ اس عمل کے ظاہری پہلو کو دیکھ کر اسے گناہ قرار دیتا ہے، کیونکہ قدم بوسی کا عمل عبادتِ الٰہی کی خاص ادا یعنی سجدہ کے مشابہ ہے۔ اور گناہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ احتیاط کی جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص جہنمی ہو گیا۔ یہ اعتدال کی راہ ہے۔ افراد و تفریط کی راہ یہ ہے کہ مفتی و فقیہ یہ کہنے لگے کہ قبر پر جھکنا شرک ہے اور صوفی یہ کہنے لگے کہ قدم بوسی کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔

ٹکراؤ کی دوسری مثال یہ ہے کہ جس بزرگ کی یاد میں ہم یہاں جمع ہیں ان کا لقب شیخ محدّث دہلویؒ ہے۔ شیخ کی دینی جدّوجہد پر کتاب و سنّت کی تعلیم و تدریس کا غلبہ تھا، اس لیے ان کا لقب شیخ محدّث پڑ گیا، حالانکہ شیخؒ قادری صوفی بھی ہیں۔ شیخ کے دوسرے رفیق کار حضرت مجدّد سرہندی ہیں، ان کی سرگرمیوں پر روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا غلبہ تھا اس لیے وہ امامِ ربّانی اور امام الصوفیہ کہلائے۔ امام ربّانی مجدّد الف ثانی کتاب و سنّت کے اس قدر پابند ہیں کہ بدعتِ حسنہ کو بھی سنّتِ نبویؐ کے خلاف سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک مکتوبِ گرامی میں مجدّد صاحب نے معرفت اور علمِ باطن کا ایک خاص نکتہ تحریر میں پیش کر دیا۔ وہ مکتوب جب شیخ محدّث کے علم میں آیا تو آپ نے اس پر سخت تنقید کی۔ اور ظاہر شریعت کے ایک امام و عالم کا یہ فرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ شیخ اور مجدّد صاحب کی وہ خط و کتابت موجود ہے۔ مجدّد صاحب نے اس سے رجوع کیا ہے اور پھر شیخؒ نے معذرت کی ہے۔

علمِ کسبی اور علمِ وہبی

علمِ باطن کو کبھی وہبی علم کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کسبی علم کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ علم کی یہ تقسیم "ماخذِ علم" کے لحاظ سے ہے۔ یعنی اگر علم حواس

خمسہ (دیکھنے، سُننے، سُونگھنے، چکھنے یا چھونے) سے حاصل ہُوا ہے تو وہ علم کسبی ہے اور اگر براہِ راست رُوح (قلب، باطن) پر خدائے علیم کی طرف سے اِلقاء ہُوا ہے تو وہ روحانی اور الہامی علم ہے۔ نبی اور رسول کا روحانی علم یقینی ہوتا ہے کیونکہ نبی و رسول کو اپنے معلّمِ حقیقی خداوندِ علیم کے ساتھ اپنے تعلّق کا واضح اِدراک و یقین ہوتا ہے اور اس کی طرف سے علم و ہدایت کے فیضان کا نبی و رسول کو واضح تصوّر ہوتا ہے۔ لیکن غیر نبی (ولی) کے اِلقاء و اِلہام میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی نہ ہو یا اس خیال میں خود میری خواہشات کی ملاوٹ نہ ہو گئی ہو۔

یہ اس آخری اُمّت کی خصوصیّت ہے کہ اس میں علمِ الٰہی کا آغاز علمِ روحانی (علمِ وحی) سے ہُوا۔ وحی قلبِ رسول پر علم کے القاء کا نام ہے۔ پھر رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم نے علمِ وحی کو تدریس و تعلیم کے ذریعہ پھیلایا اور ساتھ ہی اپنے شاگردوں (صحابہ کرام رضؓ) کے دل میں کتاب و شریعت کے رموز و حِکَم ڈالے اور یہ کام آپؐ کی روحانی اور قلبی توجّہ سے انجام پایا۔ اسی مفہوم میں علمِ باطن کے لیے علمِ لدنّی اور علمِ وہبی کی تعبیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ حضورؐ اسی معنی میں اُمّی تھے کہ تدریسِ کتاب کی احتیاج کے بغیر آپؐ کا سینہ علوم سے منوّر تھا۔ قرآن کریم نے اس الہامی علم (وحی) کو بھی لفظِ علم ہی سے تعبیر کیا ہے۔

حضور علیہ السّلام کو ہدایت کی گئی:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ : ۱۱۴)

"اور اے نبیؐ! تم قرآن حاصل کرنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک کہ اس کا نزول (وحی) پورا نہ ہو جائے اور تم دعا کیا کرو کہ اے پروردگار! میری بُوجھ (میرا علم) زیادہ کر دے۔"

شاہ صاحب نے اس آیت میں علم کا ترجمہ بُوجھ کیا ہے، کیونکہ اس دُعا کا تعلّق اس ذاتِ گرامی سے ہے جس کا علمِ ظاہری تعلیم و تدریس کے سہارے وجود میں نہیں آیا۔

چنانچہ خدا تعالےٰ کی طرف سے رسول پاکؐ پر یہ حقیقت کئی دفعہ واضح کی گئی۔ تعلیم و تدریس کا عام طریقہ یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے ساتھ ساتھ پڑھتا رہتا ہے۔ حضورؐ شروع میں اسی عام طریقہ کے مطابق جبرئیل امینؑ سے قرآن پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا تعالےٰ نے کئی دفعہ آپ کو سمجھایا کہ قرآن کریم کی تعلیم تمہارے لیے تدریسِ کتاب کے طریقے پر نہیں ہے بلکہ قلبی القاء کے طریقے پر ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس کی وضاحت کی گئی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (۱۶ - ۱۹)

"اے نبیؐ! تم اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کرو تاکہ جلدی سے قرآن حاصل کرلو۔ قرآن کا (تمہارے سینے میں) جمع کرنا اور پھر اس کا پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس کے بعد تم پڑھا کرو۔ پھر ہمارے ذمہ ہے تمہارے لیے اس کی تشریح کرنا یا دوسروں کے لیے تم سے اس کی تشریح کروانا" (بیان کے لفظ میں دونوں مفہوم شامل ہیں)

خدا تعالےٰ نے جبرئیل امینؑ کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا قرار دیا۔ سورۃ الاعلیٰ (۶) میں بھی یہی فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى "تم کو ہم پڑھا رہے ہیں، پس تم بھول کا شکار نہیں ہو سکتے۔"

جبرئیلؑ کی تلاوت کو اپنی طرف منسوب کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی تعلیم عام تدریس کے مطابق نہیں، بلکہ قلبی تعلیم اور الہام کے طریقہ پر ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے کئی بار وضاحت و تشریح کے بعد عام طریقہ کی ابتدائی عادت کو چھوڑا۔ پھر یہ صورت ہو گئی کہ خدا کی طرف سے قرآن کا طویل سے طویل حصہ جبرئیلؑ سنا دیتے اور اس کے بعد آپؐ تمام نازل شدہ حصہ کو فر فر پڑھنا شروع کر دیتے۔ یہ

بھی ایک معجزہ تھا۔

اوپر ہم نے آیت " فَاِذَا قَرَأْنٰهُ الخ " کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کے مطابق کیا ہے۔ عام طور پر " فَقَرَأْنٰهُ " کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے :۔

" جس وقت پڑھیں ہم اس کو پس پیروی کر پڑھنے میں ہماری۔"

(شاہ رفیع الدینؒ)

" پھر جب ہم پڑھنے لگیں تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے۔" (شاہ عبدالقادرؒ)

" تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔" (مولانا تھانویؒ)

فارسی کے حضرات اتباع کے لغوی مفہوم کی پابندی کر رہے ہیں :۔

پس پیروی کن خواندنِ او۔" (جرجانی)

" درپے خواندنِ اُو کُن۔" (شاہ ولی اللہؒ)

اردو والے اس ترجمہ کی پیروی سے باہر نہیں جا سکے، لیکن ادنیٰ تامّل کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تو پڑھنے کا وہی انداز ہے جس سے آپؐ کو روکنا مقصود ہے۔ یعنی دو دو لفظ یا ایک ایک آیت جبرئیلؑ تلاوت کریں اور آپؐ اس کی پیروی کریں۔ اس اشکال سے بچنے کے لیے ڈپٹی صاحب نے " پڑھ چکیں " ترجمہ کیا۔ ہندی کا لفظ " چکنا " اردو میں ختم ہونے اور مکمل ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ دلی والے اس لفظ کو تابع فعل کے طور پر اتمامِ فعل کے لیے لاتے ہیں اور کبھی تاکیدِ فعل بھی مقصود ہوتی ہے۔ داغ کہتے ہیں : ؎

بڑھایا ہم نے دل اس کا یہ کہہ کہہ کر دمِ بسمل　　لگا چک تیغ اے قاتل، کہیں قاتل بھی ڈرتے ہیں
گلی سے یار ہم اٹھ کے چل چکے تھے مگر　　مچل گیا دلِ پُر اضطراب رستے میں

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اتباع کے لغوی مفہوم کو بالکل چھوڑ دیا اور اس کا تفسیری او تاویلی ترجمہ اختیار کیا۔ جو تمام مفسرین نے اختیار کیا ہے، یعنی اتباع بمعنی استماع ۔ لکھتے ہیں :

" لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہا کرو۔" (مختصر تفہیم ص ۹۰۶)

(باقی صفحہ ۷ پر)

کاروانِ حدیث

عبدالرشید عراقی (۱۶)

امام نوویؒ

(م ۶۷۶ھ)

شارحینِ حدیث میں امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی اپنے علمی تبحّر، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت، زہد و ورع اور امانت و دیانت کی وجہ سے بہت مشہور و معروف ہیں۔

امام نووی کو علمِ حدیث اور اس کے متعلّقات سے غیر معمولی شغف تھا۔ ان کا شمار اکابر محدّثین اور ممتاز شُرّاحِ حدیث میں ہوتا ہے۔ حافظ شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام نووی حدیث و فنونِ حدیث کے حافظ و متبحر عالم رجال و اسناد اور صحیح و سقیم کی پرکھ کے ماہر تھے۔[1]"

حدیث کی طرح فقہ و افتاء میں بھی ممتاز تھے اور اپنے زمانہ کے اکابر فقہاء اور شوافع کے شیوخ میں تھے۔[2] امام نووی شافعی المذہب ہونے کے باوجود درجہ اجتہاد پر فائز تھے۔[3] گو امام نووی کی اصل توجہ حدیث، فقہ اور ان سے متعلقہ علوم کی جانب مرکوز رہی، تاہم لغت، عربیّت، صَرف، نحو اور منطق و فلسفہ سے بھی اشتغال رکھتے تھے۔[4]

امام نووی بڑے متدیّن اور عابد و زاہد شخص تھے۔ ان کی پوری زندگی عسرت میں گزری۔ بہت قانع تھے، اور اس کے ساتھ صبر و استقلال میں بھی بے مثال تھے۔ سیرت و کردار کے لحاظ سے بڑے ممتاز تھے۔ بڑے سنجیدہ و باوقار تھے۔ علمائے کرام ان کی جامعیت اور فضل و کمال کے معترف ہیں۔ علامہ ابنِ کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام نووی علاّمۂ وقت، مذہبِ شافعی کے شیخ اور اپنے زمانہ کے جلیل القدر فقیہہ اور زہد و اتقا میں بے مثال تھے۔"[۵]

امام نووی شافعی المذہب تھے اور ان کا شمار شوافع کے اساطین اور اکابر میں ہوتا تھا۔ ان کے مزاج میں حق پسندی تھی، اس لیے اُن کو اپنے مذہب کے علماء سے اختلاف کرنے اور دوسرے مذاہب کے ائمہ کے اقوال نقل کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ امام نووی عقیدہ و مسلک میں سلفِ صالحین کے مذہب پر سختی سے کاربند تھے۔ حدیث و سنّت کی اتباع اور سلف کے مسلک کی ہمنوائی اور اس کی دعوت و تلقین ان کا اصلی طرۂ امتیاز تھا۔ علامہ ابنِ سبکی (م ۷۷۱ھ) لکھتے ہیں کہ امام نووی طریقۂ اسلاف کے داعی اور متقدمین کے متبع تھے۔[۶]

امام نووی کا نام یحییٰ بن شرف تھا۔ محرم ۶۳۱ھ میں شام کے قصبہ نوٰی میں پیدا ہوئے، اس لیے نووی کہلائے۔[۷] امام نووی نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اس کا تذکرہ امام ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے تذکرۃ الحفاظ میں کیا ہے۔[۸] تحصیلِ تعلیم کے لیے امام نووی نے دمشق، مکہ، مدینہ اور بیت المقدس کے سفر کیے۔ اور ہر جگہ کے اساطینِ فن سے استفادہ کیا۔ بعد ازاں وطن واپس پہنچ کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔[۹] امام نووی نے ۴۵ سال کی عمر میں اپنے وطن نوٰی میں انتقال کیا۔[۱۰]

تصنیفات : امام نووی نے اگرچہ بہت تھوڑی عمر پائی، تاہم ان کی تصنیفات بہت مفید اور بلند پایہ ہیں۔ اربابِ سیَر نے ان کی تصنیفات کے متعلق عمدہ ریمارکس دیے ہیں۔ ان کی کتابوں میں زیادہ کتابیں حدیث اور متعلقاتِ حدیث سے متعلق ہیں۔[۱۱]

الارشاد فی علوم الحدیث : یہ اصولِ حدیث سے متعلق ہے اور علاّمہ ابنِ الصلاح (م ۶۴۳ھ) کی مشہور و معتبر کتاب مختصر علوم الحدیث کا خلاصہ ہے۔

التقریب والتیسیر فی مصطلح الحدیث : یہ کتاب الارشاد، کا مختصر ہے۔ اور اس کا نام تقریب الارشاد، بھی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت و اہمیت کا اس

سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی چار شرحیں لکھی گئی ہیں۔
شارحین کے نام یہ ہیں:-
حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین عراقی (م ۸۰۶ھ)
برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی (م ۸۵۱ھ)
شمس الدین محمد بن عبدالرحمان سخاوی (م ۹۰۲ھ)
حافظ جلال الدین عبدالرحمان سیوطی (م ۹۱۱ھ)
حافظ سیوطی کی شرح جو 'تدریب الراوی' کے نام سے مشہور ہے، بہترین فوائد پر مشتمل ہے[۱۱]

شرح البخاری: یہ صرف کتاب الایمان تک لکھی گئی ہے۔ اس کے بارے میں امام نووی لکھتے ہیں:

"میں نے شرح بخاری میں گوناگوں معلومات جمع کر دی ہیں۔ یہ مختصر ہونے کے باوجود مفید، متنوع علوم و فوائد پر مشتمل ہے۔"[۱۲]

ریاض الصالحین: ترغیب و ترہیب اور زہد و ریاضتِ نفس سے متعلق صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ معتبر اور مفید ہونے کی وجہ سے اس کتاب کو بڑی شہرت نصیب ہوئی اور یہ مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔

اربعینِ نووی: 'اربعینات' کتبِ حدیث کی ایک قسم ہے۔ مختلف علمائے کرام نے مختلف اغراض و مقاصد کے تحت اربعینات مرتب کیے ہیں۔ امام نووی نے جو اربعین مرتب کی وہ گوناگوں اغراض و رموز کی جامع ہے۔

نووی فرماتے ہیں:

"وهي اربعون حديثاً مشتملةً على جميع ذلك، و كلّ حديثٍ منها قاعدةٌ عظيمةٌ من قواعد الدّين"[۱۳]

(یہ چالیس حدیثیں ان سب امور کو شامل ہیں اور ان میں سے ہر ہر حدیث دین کے کسی عظیم الشان قاعدہ پر مبنی ہے۔)

امام نووی نے اپنی اربعین میں جو احادیث جمع کی ہیں ان میں سے اکثر روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ماخوذ ہیں۔ اربعین نووی کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بے شمار شرحیں لکھی گئیں۔ شارحین میں امام زین الدین عبدالرحمان بن احمد المعروف بہ ابن رجب البغدادی الحنبلی (م ۷۹۵ھ)، شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی (م ۹۷۳ھ)، ملّا علی قاری (م ۱۰۱۴ھ) اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن متقی شافعی (م ۸۰۴ھ) وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے اربعین نووی کی حدیثوں کی تخریج بھی کی ہے[۱۴]

شرح صحیح مسلم : اس کا اصل نام "المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن حجاج" ہے اور امام نووی کی مشہور ترین اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ صحیح مسلم کی متعدد شرحیں لکھی گئی ہیں، مگر جو مقبولیت اور شہرت اس شرح کو نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور شرح کو نہیں ہوئی۔ یہ شرح نہ مطوّل و مفصّل ہے اور نہ بہت مختصر و مجمل بلکہ متوسّط ہے۔ اس شرح کے بارے میں امام نووی کا بیان ہے کہ :

"اگر لوگوں کی ہمتیں پست نہ ہوتیں تو میں اس شرح کو ایک سو جلدوں میں مکمل کرتا، لیکن ۳ جلدوں میں ختم کر دیا[۱۵]"

اس کے شروع میں ایک تحقیقی و علمی اور جامع مقدمہ ہے، جس میں صحیحین خصوصاً صحیح مسلم کی اہمیت و خصوصیت، امام مسلم کی حدیث میں عظمت و برتری، غیر معمولی احتیاط و کاوش اور دقتِ نظر وغیرہ کے علاوہ اصولِ روایت اور فنِ حدیث کے مباحث و مصطلحات تحریر کیے گئے ہیں۔

بعض علمائے کرام نے اس شرح پر یہ اعتراض کیا ہے کہ چونکہ امام نووی شافعی المذہب تھے لہٰذا انہوں نے اس شرح میں شافعی مذہب کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ مگر امام نووی کے حامیوں نے اس اعتراض کو غلط قرار دیا ہے۔ محی السنۃ مولانا نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں :

"و منزّہ بود از تعصّبِ شافعیت و متّصف بانصاف و تنقل می کرد

در کتب خود از اقوال ابوحنیفہ[۱۶]"

(شافعی مذہب کی عصبیت سے پاک اور انصاف پسند تھے۔ اور اپنی کتابوں میں امام ابوحنیفہ کے اقوال و مسالک بھی بیان کرتے ہیں۔)

اس شرح میں فنِ حدیث کے علاوہ اس میں اصول و شرح حدیث، فقہ و احکام، تفسیر و تاریخ، کلام و عقائد، سِیَر و تراجم، رجال و انساب، لغت و ادب، صرف و نحو، اعراب و امالی اور قراءت و تجوید کے مسائل و مباحث بھی تحریر کیے گئے ہیں اور ان میں ہر ہر فن کی کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

تہذیب الاسماء واللّغات : اس کتاب میں امام نووی نے اسماء و اعلام کے الفاظ و لغات کی تشریح و توضیح کی ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں امام صاحب نے تاریخ، طبقات، رجال، تراجم، انساب، مغازی، سِیَر، تفسیر، اصول حدیث، شروحِ حدیث، فقہ و کلام، لغت و ادب اور صرف و نحو وغیرہ گوناگوں فنون کی کتابوں سے مدد لی ہے۔ اور ان میں سے اکثر کتابوں کا دیباچہ میں ذکر کیا ہے۔ اس لیے یہ کتاب عظیم فوائد و مطالب اور مباحث کا مجموعہ ہے اور اس کتاب میں امام صاحب نے رجال و طبقات اور لغت کے علاوہ حدیث و تفسیر وغیرہ متعدد علوم بھی شامل کر دیئے ہیں۔

۱؎ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ ص ۲۶۰   ۲؎ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ، ج ۳، ص ۲۰۸

۳؎ ابنِ سُبکی، طبقات الشافعیہ ج ۵ ص ۲۵۷، یافعی، مرآۃ الجنان، ج ۲ ص ۱۸۴

۴؎ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۳ ص ۲۷۸، ۵؎ ابنِ کثیر، البدایہ والنہایہ، ج ۳ ص ۲۷۸۔

۶؎ ابنِ سُبکی، طبقات الشافعیہ، ج ۵ ص ۱۶۶، ۷؎ نواب صدیق حسن خان، اتحاف النبلاء ص ۴۳۹،

۸؎ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ، ج ۴ ص ۲۶۰-۲۶۱

۹؎ یافعی، مرآۃ الجنان، ج ۴ ص ۱۸۳، ابن سبکی، طبقات الشافعیہ، ج ۵ ص ۱۶۶

ابن العماد الحنبلی، شذرات الذہب، ج ۵ ص ۳۵۵، ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۷۹

(باقی صفحہ ۷ پر)

عالمی اور قومی نقطۂ نظر سے
عربی زبان کی اہمیّت

مقالہ نگار: ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک

عربی ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیاری زبان ہے۔ فصاحتِ الفاظ اور بلاغتِ تعبیر میں دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہوگی۔ اگر اس زبان کی اہمیت کے دیگر اسباب نہ بھی ہوتے تو اوپر بیان کردہ وجوہات اتنی اہم تھیں کہ مسلمان اس کے ساتھ پیار کرتے اور اس کو پڑھنے اور سیکھنے پر اپنی توجہات مبذول کرتے۔ اس وقت میں ان جذباتی وجوہ کو چھوڑ کر ٹھوس علمی بنیادوں پر محاکمہ کرتے ہوئے عربی زبان کی اہلِ اسلام کے لئے بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان کے لئے بالخصوص اہمیت کا تذکرہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ عربی زبان کے حق میں بلند ہونے والی یہ آواز دُور رس نتائج کی حامل ہو اور ہمارے اربابِ بست و کشاد اس زبان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے پاکستان کے تعلیمی نظام میں مناسب مقام دلوانے میں کامیاب ہو جائیں۔

عربی دنیا کی اہم اور قدیم ترین زبانوں میں سے ہے۔ اس وقت دنیا کے دو سو ملین (۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰) سے زیادہ لوگ اسے بولتے ہیں۔ یہ زبان بائیس ملکوں کی سرکاری زبان ہے اور انگریزی اور ہسپانوی کے بعد سب سے بڑی زبان قرار دی جاتی ہے۔ شرق شناسانِ غرب اس حقیقت کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ عربی سامی زبانوں میں سے سب سے زیادہ قدیم ہے اور اگر یہ ان زبانوں کی ماں نہیں تو بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے ماں کے قریب تر ہے، لیکن وہ یہ تسلیم کرنے سے گریزاں رہے ہیں کہ عربی تمام السنۂ عالم کی اصل اور منبع ہے۔ لیکن حال ہی میں اس موضوع پر کام کرنے والوں نے دلائل و براہین کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی قدیم ترین زبان عربی ہے اور وہ سب زبانوں کی اصل اور بنیاد ہے۔ مجھے حال ہی میں "Arabic... the source of all languages"

——— نامی کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے' جس میں طول طویل مباحث کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عربی ہی دنیا کی قدیم ترین زبان ہے اور انگریزی' فرانسیسی' جرمن' لاطینی' ہسپانوی' فارسی اور سنسکرت وغیرہ نے اسی زبان سے جنم لیا ہے۔ تاہم اس موضوع پر ابھی مزید کام کرنے کی گنجائش ہے اور علم الالسنہ (Linguistics) کے ماہرین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس تحقیق کو مزید آگے بڑھائیں' تاکہ بغیر کسی شک و شبہ کے عربی کو تمام اقوام عالم کی اصل قرار دیا جا سکے۔

عربی زبان بعثتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے پہلے جزیرۃ العرب اور یمن کی عظیم و قدیم زبان کی حیثیت سے اپنی فصیح ترین اور ترقی یافتہ شکل میں موجود تھی۔ اس فصاحتِ لسانی کی بہترین نمائندگی عصرِ جاہلی کی شاعری کرتی ہے۔ امرؤ القیس' زُہیر بن ابی سُلمیٰ' لبید بن ربیعہ' عَمرو بن کلثوم اور دیگر جاہلی شعراء کے معلّقات کو گزشتہ ڈیڑھ ہزار سال میں ہر زمان و مکان کے عربی دان اہلِ دین و ادب نے درجۂ اول کا کلام قرار دیا ہے۔ آمدِ اسلام کے بعد عربی یمن و حجاز وغیرہ سے نکل کر ایشیا' افریقہ اور یورپ کے بہت سے ممالک میں نہ صرف علمی و دینی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی' بلکہ لاکھوں مربّع میل پر مشتمل ممالک میں قومی و سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی غالب آ گئی۔ اس سلسلے میں مصر و اندلس کے نام بطور مثال کفایت کرتے ہیں۔ عصرِ نبویؐ و خلفاءِ راشدینؓ سے عصرِ اموی و عبّاسی تک تقریباً سات سو سالہ دور عربی زبان کے بے پناہ فروغ اور غلبہ کا دور ہے' جس میں عربی دینی حیثیت کے علاوہ دنیا کی اہم ترین علمی' بین الاقوامی اور سرکاری زبان کی حیثیت سے بیک وقت افریقہ اور یورپ میں رائج و فروغ پذیر رہی اور علوم و فنون کا عظیم الشان ذخیرہ جمع و تدوین' تصنیف و تالیف اور ترجمہ و تحقیق کے ذریعے عربی زبان میں تحریر کردہ لاکھوں کتابوں کی صورت میں معرضِ وجود میں آیا۔

۶۵۶ھ میں سقوطِ بغداد کے بعد عربی صدیوں تک دنیاوی مقام کے لحاظ سے زوال پذیر رہی' مگر علومِ دینیہ کی زبان ہونے کی بنا پر عربی دان ممالک کے علاوہ بھی پورے عالمِ اسلام میں بنیادی اہمیت کی حامل رہی اور اسی دورِ زوال میں افریقہ و اندلس' فارس و تُرکستان' برِّصغیر و جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر مسلم علاقوں میں درس و تدریس' علوم و فنون اور رابطۂ عالمِ اسلامی کی زبان کی حیثیت سے فروغ پذیر رہی' حتیٰ کہ انیسویں اور بیسویں

صدی عیسوی میں عرب ممالک میں عربی زبان و ادب کے احیاء کی تحریک نے فروغ پایا اور وہ ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی بیسویں صدی کے رُبعِ آخر تک آن پہنچی۔ عصرِ جدید میں عربی زبان کی وسعت و اہمیت کے دلائل و مشاہدات بڑے واضح ہیں اور دینی حیثیت کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی، سرکاری و قومی اور بین الاقوامی حیثیت سے بھی عربی صفِ اوّل کی زبان شمار ہونے لگی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں ان مختلف نکات اور پہلوؤں کا تذکرہ کروں گا جن کی بنا پر اس زبان اور اس میں موجود ادب کے ساتھ محبت کرنا اور اس کی تحصیل و تکمیل کے لئے ہر ممکن کوشش کرنا ضروری ہے۔ ان نکات و وجوہ کی روشنی میں عربی زبان کا صحیح مقام متعین کرنے کے سلسلے میں بھی مدد مل سکتی ہے۔

عربی زبان کی اہمیت کے اسباب میں سے سب سے اہم سبب یہ ہے کہ یہ مسلمانانِ عالم کی دینی زبان ہے۔ قرآن مجید جو ہر زمان و مکان میں اسلام کا مرکز و محور اور اساسِ اوّل ہے، عربی زبان میں ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کے ذخائر اسی زبان میں محفوظ ہیں۔ عربی زبان میں محفوظ ان کتابوں کو سمجھے بغیر ہم اسلامی تعلیمات سے صحیح معنوں میں آشنا نہیں ہو سکتے۔ فقہِ اسلامی کا گزشتہ چودہ سو سال کا تمام ذخیرہ بنیادی طور پر عربی میں ہے۔ فقہِ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، زیدی، جعفری اور دیگر فکری مذاہب و آراء عربی زبان میں تحریر شدہ کتب کی صورت میں مدوّن و محفوظ ہیں۔ عصرِ جدید میں ان مذاہب و آراء کی تقلید نیز سلسلۂ اجتہاد کو آگے بڑھانے کے لئے ناگزیر ہے کہ اہلِ تخصص بالخصوص اور تمام تعلیم یافتہ مسلمان بالعموم اپنی اپنی ضروریات و حالات کے مطابق عربی میں موجود عظیم فقہی سرمایہ سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ دورِ جدید میں سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، قانونی اور دیگر تمام شعبہ ہائے حیات کی قرآن و سنت کی بنا پر تشکیلِ نو اور عصرِ حاضر کے گوناگوں مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بحث و تحقیق کی خاطر فقہِ اسلامی سے واقفیت ایک بنیادی ضرورت ہے۔ عربی زبان کی دینی اہمیت کے بارے میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جیسے عظیم فقیہ کا قول ہے: "**تَعَلَّمُوا الْعَرَبِيَّةَ فَإِنَّهَا مِنْ دِينِكُمْ**"۔

اگر ہم علومِ اسلامیہ خصوصاً فقہ میں مجتہدانہ بصیرت حاصل کرنے کے خواہاں ہیں، تو

ہمارے لئے عربی سیکھنے اور اس میں مہارت حاصل کئے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔ علامہ ابنِ خلدون نے اپنی کتاب "مقدّمہ" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
"مَعْرِفَتُهَا ضَرُورِيَّةٌ عَلَى اَهْلِ الشَّرِيعَةِ"۔

عربی زبان مسلم ثقافت کی نمائندہ زبان بھی ہے' جو قدم قدم پر انفرادی و اجتماعی زندگی میں اپنا وجود منواتی ہے۔ مسلمان بچوں کے کانوں میں پیدا ہوتے ہی اذان و اقامت کہی جاتی ہے۔ پھر دنیا بھر میں بالعموم اس کا کوئی عربی نام رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہزاروں لاکھوں عربی الفاظ ناموں کی صورت میں دنیا بھر میں معروف و مروّج ہیں۔ پھر وقتاً فوقتاً بچّہ لاشعوری طور پر السلام علیکم' بسم اللہ' الحمدللہ' اللہ اکبر' جزاک اللہ' ماشاء اللہ' ان شاء اللہ' انا للہ وانا الیہ راجعون وغیرہ کلمات سنتا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ عربی میں اذان کی آواز سنتا ہے۔ کچھ بڑا ہونے پر عربی میں کلمۂ طیبہ' پھر نماز سیکھتا ہے اور دن میں پانچ مرتبہ عربی میں ادا کرتا ہے۔ قرآن مجید کے ذریعہ عربی زبان اور رسم الخط سے مانوس و واقف ہوتا ہے۔ پھر نماز جمعہ و عیدین سے نکاح و جنازے تک مختلف اوقات اور مراحل میں اُسے عربی سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ہر اجتماع کا آغاز عربی میں تلاوتِ قرآن پاک سے کرنا عالمِ اسلام کا معمول اور ثقافتی مظہر ہے۔ اس طرح بلا امتیاز علاقہ و زبان دنیا بھر میں ہر جگہ عربی زبان مہد سے لے کر لحد تک ہر مسلمان کے ہمراہ جاتی ہے اور اس کے لئے شعوری و لاشعوری طور پر عربی سے واقفیت ناگزیر بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں مسلمان فصیح عربی زبان سیکھنے اور بولنے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ حج جیسے اجتماعات عربی کی معاشرتی و ثقافتی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہیں۔ آج بھی حج کے موقع پر جب دنیا بھر سے ہزاروں مختلف زبانیں بولنے والے مسلمان لاکھوں کی تعداد میں جمع ہوتے ہیں' تو ایک دوسرے کی زبانوں سے ناواقفیت کے باوجود عربی کے مشترکہ سرمایۂ الفاظ میں اشاروں کی زبان ملا کر ایک دوسرے کو اپنی بات سمجھاتے ہیں اور عربی زبان سے ادھوری واقفیت پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں۔ تاہم مسلمانوں میں رائج ان مشترکہ الفاظ و اسماء کی تعداد بھی ہزاروں میں ہے۔

سیرت اور اسلامی تاریخ کی تمام بنیادی کتابیں بھی عربی زبان میں ہیں' جن سے سیرت النبیؐ، سیرتِ صحابہؓ، سیرتِ تابعینؒ، سیرتِ تبع تابعینؒ اور ان کے بعد کے ادوار کے علماء و

صلحائے امت اور ائمۂ ہدایت کی سیرت معلوم ہوتی ہے۔ سیرت لٹریچر سے استفادہ اور ان اعلیٰ نمونوں پر امتِ مسلمہ کی تربیت کے لئے لازم ہے کہ ان عربی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ نیز عربی میں موجود سیرت و تاریخ کی کتابوں سے عہدِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں' جو شرعی اہمیت کی حامل ہیں۔ عہدِ بنی امیّہ اور عہدِ بنی عبّاس کی تمام تر شرعی و عمومی تفصیلات بھی عربی کتبِ تاریخ میں ہیں۔ مزید برآں زوالِ بغداد کے بعد کی صدیوں کی تاریخِ امّت بھی بطورِ مجموعی عربی کتب کی صورت میں محفوظ و مدوّن ہے' جن سے ایشیا' افریقہ اور یورپ تین برّا عظموں میں پھیلی ہوئی مسلمان قوم کی دینی و سیاسی تاریخ معلوم ہو سکتی ہے۔ ان کتابوں سے استفادہ کے لئے عربی زبان پڑھنا لازمی ہے۔

قرآن' حدیث' فقہ' تاریخ اور علوم دینیہ کے علاوہ مسلمانوں کا عام علوم و فنون کا صدیوں کا عظیم الشان ذخیرہ بھی عربی زبان میں ہے اور دینی ضروریات کے علاوہ خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی ضروری ہے کہ عربی میں تحریر شدہ ان گوناگوں علوم و فنون سے استفادہ کر کے عظیم مسلم علماء و محققین کی طب' منطق' نجوم' طبیعیات' کیمیا' نباتیات' حیوانیات' جغرافیہ' علم الافلاک' حساب اور دیگر شعبہ ہائے حیات میں عظیم خدمات سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکے' ان علوم سے استفادہ کر کے انسانیت کی تعمیر و ترقی کے لئے استعمال کیا جائے۔

یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ عبّاسی دور کے اختتام تک نہ صرف عالمِ عرب بلکہ ہند و یونان' روم و فارس اور دیگر علاقوں کے علوم ترجموں کے وسیع انتظام کے ذریعے عربی میں منتقل کئے جا چکے تھے۔ اس طرح عربی اُن غیر عرب اقوام و ممالک کے علوم کی بھی حامل ہے۔ آج بھی مختلف علوم و فنون کے ہزاروں لاکھوں عربی مخطوطات دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ ان کو از سرِ نو تحقیق و تدوین کے بعد مطبوعہ شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنا عالمِ اسلام کا علمی فریضہ اور مشترکہ ذمّہ داری ہے اور اس کے لئے سائنس اور آرٹس کے ہر مضمون کے طلبہ کے لئے عربی سیکھنا لازمی ہے۔

تاریخِ سائنس پر اب تک جو کام ہوا ہے' وہ یورپ والوں نے کیا ہے۔ وہ ہمارے اکابر کی علمی ثروت کا احتساب و جائزہ لیتے وقت انصاف پسندی سے کام نہیں لیتے۔ یہ

بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ طب طبیعیات اور کیمیا میں مسلمانوں کی بہت سی ایجادات و اکتشافات کو انہوں نے احیائے علوم کے یورپین سائنس دانوں کے نام منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ انہوں نے یہ معلومات عربی کتابوں کے لاطینی تراجم سے حاصل کی تھیں۔ مثلاً دورانِ خون کا تصوّر سب سے پہلے مسلمان طبیب ابن نفیس نے دیا لیکن اس کا انتساب ولیم ہاروے کے ساتھ کیا گیا۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے سائنس دان عربی زبان میں اصل کتابوں سے مستفید ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور ہمارے عربی جاننے والے سائنس سے واقف نہیں۔ ان حالات میں ایسے علماء کی ضرورت بڑی شدّت سے محسوس کی جا رہی ہے جو بیک وقت دونوں علوم کے ماہر ہوں۔

عالمِ اسلام کی جُملہ زبانوں مثلاً فارسی، ترکی، اردوؔ سواحلی اور ملائی کے مطالعے کے لئے بھی عربی زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ عربی کے علم کے بغیر ان زبانوں کے بہت سے محاورات، تراکیب، استعارات اور تشبیہات کی وضاحت نہیں کی جا سکتی، کیونکہ ان زبانوں کے کثیر الفاظ عربی اصل سے ماخوذ ہیں۔ ان کا رسم الخط عربی رسم الخط سے مُستنبط ہے اور ان زبانوں کے ادب پر عربی ادب کی گہری چھاپ ہے۔ پروفیسر ای۔ جی براؤن فارسی ادب پر عربی زبان کے گہرے اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"I began my oriental studies with Turkish & was soon driven to Persian, since from Persian the Turks borrowed their culture and Literary form. Soon I found that without a knowledge of the Arabic language and literature and of the Arabian civilization and culture, one could never hope to be more than a smatterer in Persian".

پروفیسر براؤن نے جس حقیقت کی نشاندہی کی ہے، ایرانی اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی مدارس میں عربی ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔

عالمِ اسلام کی جُملہ زبانوں میں سے صرف عربی میں یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ عالمِ اسلام کی ایک بین الاقوامی زبان کا کام دے سکے۔ کیونکہ اس زبان کے سمجھنے اور پڑھنے والے تمام اسلامی ممالک میں موجود ہیں۔ ہر مسلمان تھوڑی بہت عربی ضرور سمجھتا ہے۔ اسے کچھ عربی الفاظ بھی آتے ہیں اور وہ ان کے معانی سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ وہ کون سا

مسلمان ہوگا جسے چند آیاتِ قرآنیہ زبانی یاد نہ ہوں اور چند عربی دعائیں نہ آتی ہوں۔ آج کل مسلمان ایک متحدہ پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی کوشش کر رہے ہیں ISESCO Organization of Islamic Unity اور اس طرح کے دوسرے اداروں کا قیام اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ تمام اسلامی ممالک کے درمیان لسانی اتحاد بھی ہو۔ یہ خدمت انجام دینے کی صلاحیت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے۔

اب تک میں نے اپنے آپ کو عربی زبان کی اہمیت کے ان اسباب تک محدود رکھا تھا جن کا امّتِ اسلامیہ کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے' لیکن اس زبان کی اہمیت کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن کا مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کے ساتھ بھی تعلق ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان سامی زبانوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور یہ قدیم ترین سامی زبان ہے۔ چونکہ عرب ایک دور دراز علاقے میں جو ہر طرح کی آویزشوں سے محفوظ رہا' رہائش پذیر تھے' اس لئے ان کی زبان اصلی حالت پر باقی رہی اور دیگر سامی زبانوں کی طرح اس میں نہ تو تبدیلیاں آئیں اور نہ ہی غیر اقوام کے محاورے اور الفاظ داخل ہوئے۔ بنابریں سامی زبانوں میں سے عربی اپنی اصل حالت کے سب سے زیادہ قریب ہے۔ اس لئے سامی لسانیات کے مطالعہ کے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ چنانچہ مختلف سامی زبانوں کے غامض اور غیر معروف الفاظ کی تشریح و توضیح کے لئے دورِ حاضر میں اکثر عربی زبان کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

بعینہٖ بائبل اور دیگر قدیم کتبِ سماوی کے مطالعہ یعنی "Biblical Studies" کے لئے عربی زبان بہت اہمیت رکھتی ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدا ہی سے عبرانی زبان کے مشکل و غامض الفاظ کی تشریح و توضیح کے لئے عربی زبان سے مدد لی جا رہی ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ و محاورات جن کے معانی و مفاہیم یہودی ادب سے متعیّن نہیں ہو سکتے' عربی زبان کی مدد سے بہت آسانی سے حل ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر الفرڈ گیوم اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Indeed, no serious student of the old testaments can afford to dispense with a first hand knowledge

of Arabic. The pages of any serious critical commentary on old testament will illustrate the debt that biblical exegesis owes to Arabs".

بائبل کی غامض آیات کی تشریح میں عربی زبان سے مدد لینے کا سلسلہ ۱۸ویں صدی ہی سے شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ڈچ مستشرق Albert Schultens نے اپنی کتاب "The Use of Arabic in the interpretation of scripture" میں بائبل کی تفسیر میں عربی سے مدد لینے کے اصول و ضوابط بیان کئے ہیں۔ عرب علماء نے بائبل کے مفسرین پر گہرا اثر ڈالا' چنانچہ انگلستان میں Edward Pocoke اور رابرٹسن سمتھ نے اور جرمنی میں جولیس ولہازن نے بائبل کی تفاسیر عربی زبان کی مدد سے کیں۔

عربی زبان میں اسلامی حکومت کی عیسائی رعایا کے احوال و کوائف' اُن کے گرجوں اور اُن کی عبادت گاہوں کے بارے میں بھی بہت سی کتب تالیف کی گئیں۔ دسویں صدی میں سعید البطریق نے "نظم الجوہر" کے نام سے ایک کتاب لکھی اور گیارہویں صدی میں الیاس بار شنعہ نے عربی اور سریانی میں عیسائیوں کے لئے کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں آج بھی موجود ہیں اور اُن سے اس دور کی عیسائی رعایا کی تہذیبی و تمدّنی اور ثقافتی حالت کا علم ہوتا ہے۔

عیسائیوں نے عربی کو ایک علمی و ثقافتی زبان کی حیثیت سے اپنا لیا تھا اور وہ عربی سیکھنے میں اپنی دینی کتابوں کے مطالعہ کی نسبت زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ چنانچہ قرطبہ کے بشپ الوارو نے ایک دفعہ اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا تھا:

"My fellow christians delight in the poems of romance of the Arabs; They study the works of Muhammadan Theologians and philosophers, not in order to refute them, but to acquire a correct and elegant style, where can today a layman be found who reads the Latin commentary on Holy Gospel. Alas! the Christians who are most conspicious for their talent have no knowledge of any literature or language save Arabic".

دورِ حاضر میں بھی عیسائی' عربی زبان کے ساتھ اسی طرح لگاؤ کا اظہار کر رہے ہیں جس طرح قرونِ وسطیٰ میں کرتے تھے' چنانچہ مشرقِ قریب کے جملہ عیسائی اپنی بائبل مطالعہ عربی میں کرتے ہیں۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی آرامی کا ایک dialect

بولتے تھے جو عربی سے بہت ملتا جلتا تھا۔

عربی زبان کی اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں یونانی اور دیگر اقوام کی کتابوں کے جو عربی تراجم کئے گئے' وہ موجود ہیں اور ان میں سے بہت سے زیورِ طبع سے آراستہ بھی ہو چکے ہیں۔ یونانی مؤلفین کی بہت سی اصل کتابیں اصل یونانی میں نابود و نادر الوجود ہو چکی ہیں لیکن ان تراجم کی بدولت متعدّد یونانی کتب کو دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔
مشہور برطانوی مستشرق سائمن اوکلے نے عربی زبان کی اہمیت کا ایک اور نقطۂ نظر سے تذکرہ کیا ہے۔ اس کے خیال میں یونانی کتابوں کے عربی تراجم ان کتابوں کے یونانی مخطوطات کے الفاظ و متون کی تصحیح و تحقیق کے بارے میں بہت ممدّ و معاون ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ تراجم ان میں سے قدیم ترین مخطوطات سے بھی پہلے لئے گئے ہیں' لہٰذا متن متعیّن کرتے وقت ان عربی تراجم سے استفادہ یقیناً مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ القفطی کی "تاریخ الحکماء" میں ۴۱۴ یونانی' شامی اور مسلمان حکماء' اطبّاء اور ماہرین ہیئتِ افلاک کے حالات موجود ہیں۔ یہ کتاب علامِ یونان کے بارے میں معلومات کا ایک ایسا خزینہ ہے جو اصل یونانی زبان میں مفقود الخبر ہو چکا ہے۔ اسی طرح محمد بن اسحٰق الندیم البغدادی نے اپنی کتاب "الفہرست" کی ساتویں جلد میں Thales سے لے کر Plutarch تک یونانی فلاسفہ و حکماء کے اسماء اور ان کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ معلومات یونانی کتب کے تراجم کے ذریعے عربوں تک پہنچی تھیں۔

تاریخِ اقوامِ عالم کے مطالعے کے لئے بھی عربی زبان کا سیکھنا بے حد مفید ہے۔ تاریخ' عربی ادب کا ایک اہم شعبہ ہے اور عربی زبان میں تاریخ پر اتنی کثیر تعداد میں کتابیں تالیف کی گئیں کہ دنیا کی کوئی دوسری زبان ان میں عربی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ عربی زبان میں تاریخ پر کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب Wustenfeld نے اسلام کے ابتدائی ایک ہزار سال کے مؤرخین کا ایک جائزہ پیش کیا تو اس نے ۵۹۰ اسماء کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اکثر مؤرخین نے تاریخِ عمومی (Universal History) پر متعدّد مجلّدات پر مشتمل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان کتابوں کی ابتداء عام طور پر ابتدائے آفرینش سے کی جاتی تھی اور ان میں مسلمانوں سے پہلے گزری ہوئی اقوام اور مسلمانوں کی ہم عصر غیر مسلم اقوام کی تاریخ کے بارے میں بھی

بہت اہم معلومات پائی جاتی ہیں۔ ہم مثال کے طور پر البیرونی کی کتاب "تاریخ الہند" کا ذکر کر سکتے ہیں جس میں اُس دور کے ہندوستان کے مذاہب، فلسفہ، ادب، تاریخ، ہیئت، عادات و خصائل اور معاشرتی و فلاحی اداروں کا ذکر موجود ہے۔

متعدد روسی مستشرقین نے عربی زبان کی ادبی و تاریخی کتب کی مدد سے اسلامی سلطنت کی شمالی حدود پر مقیم قدیم اقوام کے بارے میں بہت دلچسپ حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ مشہور جرمن مستشرق Leopold Yon Ranke کا قول ہے:

"Arabic is the most important of all languages of the world for purpose of Universal History".

پروفیسر Robert Flint اپنی کتاب "Philosophy of History" میں لکھتے ہیں:

"The histories of Muhammadan countries in the Middle Ages have been as fully recorded by Muhammadan annalists as those of various regions of Christiandom".

تاریخ سائنس کے مطالعہ کے لئے بھی عربی زبان کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ تمام پڑھے لکھے لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں سائنس کی مختلف فروع میں بہت مفید اور اہم اضافے کئے۔ انہوں نے اپنے سے قبل کی متمدن اقوام کے علوم کو سیکھا۔ ابتدائی دور میں ان کی حیثیت محض شاگردوں کی تھی۔ انہوں نے غیر اقوام کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں۔ ترجمہ کے بعد انہوں نے مختلف علوم و فنون پر پورا پورا کمال حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ذاتی ریسرچ شروع کی اور تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ وہ علوم میں اپنے استادوں پر بازی لے گئے۔ علوم کی تاریخ میں الکندی، الفارابی، الرازی، الغزالی، جابر بن حیان، ابن الھیثم، ابن سینا، زاھراوی اور البیرونی ایسے سینکڑوں فاضلانِ روزگار کا نام سنہری حروف میں ثبت رہے گا۔ جب مسلمان طب، کیمیا، ریاضیات، فلسفہ اور دیگر علوم کا مطالعہ کر رہے تھے، یورپ جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے مشعلِ علم ہاتھ میں لے کر ظلمت کدۂ یورپ کو بھی منور کیا۔ مسلمانوں کے اس احسان کو یورپ کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ یورپ میں احیائے علوم کی تحریک (The Renaissance) مسلمانوں کے اثرات کے تحت شروع ہوئی اور مسلمانوں کی کتابیں ایک مدتِ دراز تک درسی کتابوں کے طور پر یورپ میں پڑھائی جاتی

رہیں اور اُن کو یورپ کی مختلف زبانوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ دورِ حاضر میں یورپ نے سائنس میں جو ترقی کی ہے' اس کی بنیاد ان علوم پر ہے جو مسلمانوں نے یورپ کے سپرد کیئے تھے۔ مسلمانوں کی یہ جملہ کتابیں عربی زبان میں ہیں اور سائنس کی تاریخ کے مرتّبین کے لئے ان کا مطالعہ لازمی ہے۔

اٹھارویں صدی کے مشہور انگریز ادیب Samuel Johnson کو جب برطانوی حکومت نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر پنشن سے نوازا' تو انہوں نے بلا اختیار کہا: "کاش ایسا آج سے ۲۰ برس پہلے ہوا ہوتا اور میں استنبول جاکر Pocoke کی طرح عربی زبان پڑھتا"۔

اسی طرح ایک دوسرے برطانوی عالم جان بک مین جس نے ایجادات و اکتشافات پر ایک کتاب لکھی ہے' عربی زبان کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Had I twenty years to live and could hope for as abundant supply of Arabic work, I would gladly learn Arabic".

اس سے سائنسی اور انسانی ذہن کے ارتقاء کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے عربی کی اہمیت کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے نقطۂ نظر سے عربی خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے عرب ممالک کے ساتھ خصوصی تعلقات ہیں اور ان تعلقات کو مزید مضبوط بنانے میں عربی بہت مدّد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس وقت ہم ایک غیر زبان یعنی انگریزی کی وساطت سے افہام و تفہیم کا سلسلہ طے کر رہے ہیں۔ اگر ہم انگریزی کی جگہ اپنی زبان عربی کو استعمال کرنے کی صلاحیت پیدا کر لیں تو پاک عرب تعلقات کے سلسلے میں ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے' جس کی خصوصیات اخوّت' یگانگت' تعاون اور محبت و مودّت ہوں گی۔

عربی چونکہ بہت سے ممالک کی سرکاری زبان ہے' اس لئے سیاسی طور پر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے U.N.O نے اس کو اپنی منظور شدہ زبانوں کی فہرست میں شامل کر لیا ہے۔ ہماری فارن سروس کے اراکین کے لئے اس زبان کا سیکھنا لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر وہ عرب ممالک میں اپنا کام ٹھیک طریقے سے انجام نہیں دے سکتے۔

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور سائنس (۳)

مقصودِ مکتب

اس دور میں مسلمانوں نے بھی اپنی تاریخ و روایات اور قرآن کے ارشادات کو فراموش کر کے عیسائی مغرب کی کورانہ تقلید میں مغرب کی بے خدا سائنس کو، جسے اقبال "اندیشۂ لادین" کہتا ہے، اپنا لیا ہے۔ اس وقت تمام عالمِ اسلامی میں مسلمانوں کے مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں بے خدا سائنس کی درس و تدریس میں مصروف ہیں، جس کی وجہ سے پورے عالمِ اسلامی میں نوجوان تعلیم یافتہ افراد اسلام سے دُور اور دُور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال اس صورتِ حال پر بار بار اظہارِ افسوس کرتا ہے۔ اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمیں مدرسہ اور کالج میں خدا کا عقیدہ پھر اپنے مقام پر واپس لانا چاہیئے۔ تعلیم کا تو مدعا ہی یہ تھا کہ خودی کو اپنی زندگی کے ایک ہی مقصد کی تکمیل کے لیے سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اور یہ مقصد علم اور عمل کے ذریعہ سے خدا کی محبّت کے جذبہ کی آزادانہ نشوونما اور تسکین اور تشفّی ہے۔ اقبال کو افسوس ہے کہ مکتب کو اپنے مقصود کا ہی علم نہیں۔ جبھی تو وہ خدا کی محبّت (جذبِ اندروں) کی پرورش کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست
تا بجذبِ اندروش راہ نیست

خدا کی محبّت کی شراب (مئے یقین) ہی زندگی میں سوز یا گرمیٔ عمل پیدا کر سکتی ہے۔ خدا کرے کہ توحید کا عقیدہ نظامِ تعلیم کی بنیاد بنے تاکہ یہ گرمی پیدا کرنے والا آگ کی طرح کا پانی مدرسہ کو بھی نصیب ہو۔

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز
نصیبِ مدرسہ یارب یہ آبِ آتش ناک!

دورِ حاضر کے مکتب کا بے خدا نظامِ تعلیم طالب علم کو اس قابل نہیں رہنے دیتا کہ وہ عمر بھر خدا کا

نام لے سکے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کہ کسی کا گلا گھونٹ دیا جائے کہ پھر اس سے لا الٰہ الا اللہ کی صدا نہ نکل سکے:

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ؟

مغربی نظامِ تعلیم جو اب مشرق میں بھی رائج ہے، اس اصول پر مبنی ہے کہ طالب علم کو کسی عقیدہ کی تعلیم نہیں دینی چاہیے، تاکہ اس کی عقل آزاد رہے اور اس میں خود ہر بات پر غور و فکر کر کے اسے رد یا قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو۔ اگر استاد کی طرف سے اس پر کوئی عقیدہ ٹھونسا گیا تو پھر اس کی سوچ و بچار ایک تنگ دائرے کے اندر مقید ہو جائے گی۔ لیکن اس اصول پر عمل کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ طالب علم کی عقل تو آزاد ہو جاتی ہے، لیکن چونکہ اس کے خیالات کا کوئی مرکز یا محور نہیں بنتا، وہ بغیر کسی ضبط یا نظم کے رہ جاتے ہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ طالب علم کے اندر اس عقیدہ کو پیدا کیا جاتا اور پختہ کیا جاتا جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے اور جس کے لیے اس کی فطرت پیاسی ہے، یعنی خدا کا عقیدہ! ایسی حالت میں اس کے ذہن پر کوئی خارجی اور مصنوعی دباؤ نہ پڑتا بلکہ وہ اپنی فطری آزادی کو حاصل کر لیتا اور اس کو غلام بنانے والے یا اس کی فطرت سے ہٹانے والے تمام تصورات خارج از بحث ہو جاتے اور اس کے ساتھ ہی اس کے خیالات کے اندر ایک ربط یا نظم بھی پیدا ہو جاتا۔ کیونکہ پھر یہ عقیدہ اس کے تمام خیالات کا مرکز یا مدار بن جاتا اور وہ ان کو اپنے اس عقیدہ کو روشنی میں دیکھ سکتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مغرب میں ایسے نظامِ تعلیم کے پیدا کیے ہوئے تعلیم یافتہ افراد کے دلوں میں خدا کی محبت مردہ ہوتی ہے۔ اور اگر مشرق میں ایسے نظامِ تعلیم کے باوجود خدا کی محبت پھر بھی زندہ رہتی ہے تو مکتب کی راہ نمائی نہ ہونے کی وجہ سے مکتب جو خیالات اور افکار طالب علم کے ذہن میں پیدا کرتا ہے وہ خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں ہوتے اور ان میں کوئی فطری ربط نہیں ہوتا اور وہ مغرب کے گوناگوں غیر فطری عقائد کے تصرف میں آجاتے ہیں۔ ایسی حالت میں عقل مغرب کی غلامی کی وجہ سے غلط طریق پر کام کرتی اور غلط سمت میں سوچتی ہے۔

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اگرچہ خدا کا عقیدہ انسان کی فطرت ہے۔ تاہم یہ مشتِ خاک انسان اس طرح سے بنا ہے کہ اگر اس کی مناسب قسم کی تعلیم و تربیت نہ ہو تو وہ اپنی فطرت کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اور غلط اور ناقص تصوّرات کو خدا سمجھ بیٹھتا ہے۔ اگر ہمارا خیال یہ ہو کہ اگر ہم طالب علم کو آزاد رہنے دیں تو اس کے دل میں خدا کی محبّت خود بخود پیدا ہو جائے گی، اس لیے کہ یہ اس کی فطرت ہے، تو یہ خیال درست نہیں۔ خدا کے عشق کی آتش ہمہ سوز خودی کی مناسب پرورش اور تربیت کے بغیر روشن نہیں ہوتی۔ صوفیاء کا قول ہے کہ خدا کی محبت ایک آگ ہے جو ماسوی اللہ کو جلا دیتی ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خلک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

خدا کے عقیدہ کو کالج کے سائنسی علوم سے نکال دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص اپنا گھر روشن دیکھنا چاہتا ہو لیکن ایک بڑی سی دیوار بنا کر سورج کی روشنی کو مسدود کر دے۔ پروفیسر ایک عمارت گر ہے اور جو عمارت وہ تعمیر کر رہا ہے وہ روحِ انسانی ہے۔ حکیم قاآنی نے ایک عمدہ بات کہی ہے، جو پروفیسر کو مدِّنظر رکھنی چاہیے کہ اگر اپنے گھر کے صحن کو روشن رکھنا چاہتے ہو تو صحیح عمارت گری یہ ہے کہ سورج کے سامنے دیوار کھڑی نہ کرو۔

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر — جس کی صنعت ہے روحِ انسانی
نکتۂ دلپذیر تیرے لیے — کر گیا ہے حکیم قاآنی
پیشِ خورشید بر مکش دیوار — خواہی ار صحن خانہ نورانی

متاعِ دین و دانش کا زیاں

پھر بھی ہم یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہماری نئی نسلیں صحیح طور پر مسلمان ہوں۔ گویا ہم بے خدا سائنس کے روح فرسا نتائج اور اثرات سے بالکل بے خبر ہیں۔ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو بلند ترین کتابوں کے ذریعہ سے یہ بتائیں کہ علمِ اخلاق، علمِ سیاست، علمِ اقتصادیات، علمِ تعلیم، علمِ قانون وغیرہ میں خدا کہیں نہ آتا ہے اور نہ آ سکتا ہے، اور پھر یہ توقع رکھیں کہ ان نوجوانوں کی اخلاقی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور قانونی سرگرمیاں باخدا ہوں گی۔ لہٰذا اقبال تنبیہ کرتا ہے کہ اس بے خدا سائنس کی تعلیم کو بے خطر نہ سمجھو۔

اس سے تمہاری پوری قوم کی رُوح فنا ہو رہی ہے۔

مشو ایمن ازاں علمے کہ خوانی!
کہ از وے رُوحِ قومے راتواں کشت

ہمارے کالجوں کی بے خدا سائنس کی تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم مغربیت اور جدیدیت کے کافر ادا معشوق کے خونریز غمزوں پر ایسے مرمٹے ہیں کہ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس طرح سے ہم نے دین کی متاع کو ہی نہیں بلکہ دانش (یعنی سچی باخدا سائنس) کی متاع کو بھی لٹا دیا ہے۔ حالانکہ اللہ والوں کی حیثیت سے دین اور دانش کی دونوں نعمتیں ہمارے لیے ہی مخصوص تھیں۔

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی — یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خونریز ہے ساقی!

غیروں کی تربیت دی ہوئی اور غیروں کے نظریۂ کائنات میں رنگی ہوئی بے خدا سائنس کا پڑھنا اور پڑھانا ایسا ہی ہے جیسے اپنے منہ کو غیروں کے تیار کیے ہوئے غازہ کے استعمال سے خوبصورت بنانے کی کوشش کرنا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنی قدر و قیمت کو دوسروں کے شعار کی نقل پر موقوف سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اپنے قومی امتیازات کو بالکل کھو چکے ہیں، ہماری عقل دوسروں کے خیالات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور خود آزادی سے کچھ نہیں سوچ سکتی، ہماری ذہنی اور ثقافتی زندگی کا ہر سانس دوسروں کا محتاج ہو گیا ہے، ہماری زبانوں پر ایسی گفتگو ہے جو دوسروں سے مانگی ہوئی ہوتی ہے، اور ہمارے دلوں میں ایسی آرزوئیں ہیں جو دوسروں سے مستعار لی ہوئی ہیں۔ اقبال اس صورتِ حال پر افسوس کرتے ہوئے لکھتا ہے:

علمِ غیر آموختی اندوختی — رُوئے خویش از غازہ اش افروختی
ارجمندی از شعارش مے پری — من ندانم تو توئی یا دیگری
عقلِ تو زنجیریِ افکارِ غیر — در گلوئے تو نفس از تارِ غیر
بر زبانت گفتگو ہا مستعار — در دلِ تو آرزو ہا مستعار
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے — ز آتشِ خود سوز اگر داری دلے

عالمِ نو کی نقشبندی

توحید کا عقیدہ جب مظاہرِ قدرت کے علم کے ساتھ یعنی سائنس کے طبیعیاتی، حیاتیاتی

اور نفسیاتی حقائق کے ساتھ مل جاتا ہے تو اس کے اندر جاذبیت اور کشش کی ایک ایسی قوّت پیدا ہو جاتی ہے جس کا حملہ ہمارے بدترین دشمنوں کو بھی بے بس کر سکتا ہے۔ یہ قوت ایک ایسا آلۂ حرب و ضرب بن جاتی ہے جس کا مقابلہ دورِ حاضر کے بہترین سامانِ حرب سے بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس قوّت کا حملہ دشمنوں کے دلوں کو مسخّر کر کے ان کو دوست بنا دیتا ہے اور پھر ان میں مقابلہ کی ہمّت ہی باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اپنا سارا سامانِ حرب بخوشی حملہ آوروں کے سپرد کر دیتے ہیں۔ گویا اگر عقیدۂ توحید سائنس کے ساتھ مل جائے تو وہ ایک ایسا سامانِ جنگ بن جاتا ہے جس سے ہم دوسروں کو تیغ و تفنگ کے بغیر مغلوب کر سکتے ہیں۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وجہ ہے کہ اقبال مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ سائنس کو عقیدۂ توحید کے ساتھ ملحق کر کے ایک پُرامن عالمگیر انقلاب پیدا کریں۔ اہلِ مغرب کے لیے سائنس (زیرکی) زندگی کا سامان ہے۔ اہلِ مشرق کے لیے خدا کی محبّت کائنات کا راز ہے۔ سائنس خدا کی محبّت کے ساتھ مل کر حق شناس بن جاتی ہے۔ ورنہ وہ غلطیاں کرتی اور ٹھوکریں کھاتی رہتی ہے۔ دوسری طرف سے دنیا میں خدا کی محبّت کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا کام یعنی نشر و اشاعتِ کلمۂ توحید جس میں خدا کا سچّا عاشق لگا رہتا ہے، سائنس کی مدد سے پختہ بنیادوں پر قائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ جب خدا کی محبّت اور سائنس ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے تو ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہمّت کر کے اُٹھے اور سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ بہم کر کے ایک نیا عالمگیر انقلاب پیدا کرے۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات، شرقیاں را عشق رمزِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس، کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر بود، نقشبندِ عالمِ دیگر شود
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ، عشق را با زیرکی آمیزدہ

قرآن حکیم میں کئی آیات ایسی ہیں جن میں اسلام کے آخری عالمگیر غلبہ کی زوردار پیشگوئیاں

کی گئی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اگر اسلام کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کا ذریعہ خود مسلمان قوم ہی بنے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (الرعد:۱۱)

"بیشک خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے حالات کو نہ بدلیں"۔

بے خدا سائنس کی مخالفت

یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ اب مغرب کا فکر بھی بے خدا سائنس کے خلاف ردِّ عمل کر رہا ہے۔ پٹی رم سوروکن (Pitirim Sorokin) جو ہارورڈ یونیورسٹی میں سوشیالوجی کا پروفیسر رہا ہے اپنی کتاب "ہمارے دور کا بحران" (The Crisis of our Age) میں لکھتا ہے:

"مذہب اور سائنس کی موجودہ مناقشت خطرناک ہی نہیں غیر ضروری بھی ہے۔ اگر حقیقت کے صحیح اور مکمل نظریہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو پھر وہ دونوں ایک ہی ہیں اور ایک ہی مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ اور وہ مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفات کو عملی دنیا میں بے نقاب کیا جائے تاکہ انسان کی شرافت اور خدا کی عظمت دونوں آشکار ہوں"۔

اسی طرح سے فیلڈ مارشل سمٹس (Field Marshall Smuts) جو فلسفہ کی ایک نہایت ہی عمدہ اور اونچی کتاب 'کلیت' (HOLISM) کا مصنّف ہے لکھتا ہے:

"سچائی کی بے لوث جستجو میں اور نظم اور حُسن کے مشاہدہ کے ذوق کے اعتبار سے سائنس آرٹ اور مذہب کے بعض اوصاف وخواص سے حصہ لیتی ہے۔ یہ کہنا قرینِ انصاف ہوگا کہ شاید سائنس دورِ حاضر کے لیے خدا کی ہستی کا واضح ترین انکشاف ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مستقبل میں نوعِ انسانی جو بڑے بڑے کام انجام دے گی ان میں ایک یہ ہوگا کہ وہ سائنس کو اخلاقی قدروں کے ساتھ ملحق کرے گی اور اس طرح سے اس بڑے خطرہ کو دُور کرے گی جو اس وقت ہمارے مستقبل کو درپیش ہے"۔

لیکن حقیقت کا صحیح اور مکمل نظریہ جس کی روشنی میں سوروکن کے خیال میں مذہب اور سائنس ایک نظر آتے ہیں فقط مسلمان قوم کے پاس ہے۔ کیونکہ خدا کا اسلامی تصوّر خالص اور شرک کی تمام آلائشوں سے پاک ہے۔ دنیا میں اسلام کے سوا تے کوئی اور مذہب ایسا نہیں جو خدا کے تصوّر کی پاکیزگی پر اتنا زور دیتا ہو۔ پھر خدا کے اسلامی تصوّر میں یہ بات بھی شامل ہے کہ مظاہرِ قدرت

جن کا مشاہدہ اور مطالعہ سائنسدان کا کام ہے خدا کی ہستی اور صفات کے نشانات ہیں اور خدا کی صفات ان کے اندر آشکار ہیں۔ مظاہرِ قدرت کا علم جسے سائنس کہتے ہیں خدا کے اسلامی تصوّر سے الگ نہیں ہو سکتا۔ یہ حقائق اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ خدا اور خدا کے تصوّر سے پیدا ہونے والی اخلاقی اقدار کو سائنس کے ساتھ ملحق کرنے کا عظیم الشان کام جو فیلڈ مارشل سمٹس کے خیال کے مطابق نوعِ انسانی آئندہ انجام دینے والی ہے، صرف مسلمانوں کے ہاتھ سے ہی انجام پا سکتا ہے۔

نقشِ ناتمام

اگر ہم مسلمانوں کے دینی، علمی، اخلاقی اور سیاسی انحطاط کے اسباب کا تجزیہ کریں تو ان میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ بنیادی سبب یہی نکلے گا کہ انہوں نے اپنی تعلیم کے لیے بے خدا سائنس کو اپنا لیا ہے۔ لہٰذا اس سبب کے ازالہ سے ان کا انحطاط زائل ہو سکتا ہے۔ اور قرآن کی پیشگوئیوں کے مطابق ان کے عالمگیر غلبہ کے لیے راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان قوم کا یہ رول مقدر ہے کہ وہ اپنی یونیورسٹیوں میں سائنسی علوم کی نصابی کتابوں میں خدا اور سائنس کا الحاق کر کے اپنے دینی جذبہ کے احیاء اور عقیدۂ توحید کی نشر و اشاعت کا سامان پیدا کریں گے۔ دراصل ہمارے نظریۂ حیات کی ممکنات کے اندر ہی اس بات کی شہادت موجود ہے کہ ہم مستقبل کے اس عالمگیر انقلاب کا باعث بنیں گے جس کی تمنّا اقبال نے کی ہے۔ تاہم جب تک کہ نوعِ انسانی سائنس کو خدا کے عقیدہ کے ساتھ ملحق نہیں کرے گی اس وقت تک وہ اپنے کمال کی جانب جو اس کی منزلِ مقصود ہے قدم نہ اُٹھا سکے گی۔ اور نقّاشِ ازل کا نقش یعنی انسان جس کی تکمیل کے لیے اس نے یہ ہنگامۂ عالم برپا کیا ہے نامکمل رہے گا، کیونکہ عقل اور عشق دونوں مل کر ہی انسان کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ جب دونوں مل جائیں گے تو نہ عقل بے زمام رہے گی اور نہ عشق اپنے مقام سے محروم رہے گا۔ اور جب تک دونوں الگ الگ رہیں گے اس وقت تک نہ عقل اپنا صحیح راستہ پا سکے گی اور نہ ہی عشق اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے گا۔

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

لغات واعراب قرآن (۲۵)

پروفیسر حافظ احمد یار

سورۃ البقرۃ (۱۸)☆

(آیت: ۲۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغۃ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغۃ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳ اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغۃ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے مثلاً ۲:۵:۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲:۵:۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲:۱۸: الإعراب

آیت زیر مطالعہ دراصل پانچ مستقل چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے جن میں سے بعض واو عاطفہ کے ذریعے باہم ملا دیئے گئے ہیں۔ اعراب کی تفصیل یوں ہے:۔

☆ لغات و اعراب قرآن کی پچھلی قسط میں سورۃ البقرہ کے ساتھ ۱۹ نمبر درج تھا۔ قارئین نوٹ فرمالیں کہ وہ درست نہیں تھا۔ سورۃ کے نام کے ساتھ درج کردہ نمبر درحقیقت قطعہ نمبر کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے قبل قطعہ نمبر ۱۷ حکمت قرآن کے دو شماروں میں منقسم ہو کر شائع ہوا تھا۔ اس کی دوسری قسط میں عنوان کے ساتھ غلطی سے نمبر ۱۸ درج کر دیا گیا تھا۔ نوٹ فرما لیجئے کہ مئی میں شائع شدہ قسط دراصل قطعہ نمبر ۱۷ کی دوسری قسط تھی، اسی طرح جون میں شائع ہونے والی قسط کو قطعہ نمبر ۱۸ کا جزو اوّل قرار دینا صحیح ہوگا۔

(۱) ولبشر الذین اٰمنو وعملوا الصلحت اَنَّ لھم جنت تجری من تحتھا الانھر ۔

[وَ] عاطفہ ہے جو اس (آنے والے) جملے کو سابقہ جملے (آیت) سے ملاتی ہے۔[لبشّرْ] فعل امر صیغہ واحد مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعل " انتَ " مستتر ہے۔[الّذینَ] اسم موصول یہاں فعل (لبشّرْ) کا مفعول بہ ہو کر منصوب ہے۔ یعنی " تو خوشخبری سنا ان لوگوں کو جو کہ ....."[آمنوا] فعل ماضی معروف مع ضمیر فاعلین " ھم " جملہ فعلیہ بن کر " الذین " کا صلہ ہے۔ (بلکہ یہاں سے صلہ شروع ہوتا ہے)۔ [وعملوا] میں " وَ " عاطفہ ہے جس کے ذریعے " عملوا " کا " آمنوا " پر عطف ہے۔[الصالحات] فعل " عملوا " کا مفعول بہ (لھذا) منصوب ہے ۔ اس میں علامتِ نصب آخری " ت " کا کسرہ (ـِ) ہے کیونکہ یہ جمع مؤنث سالم ہے۔[اَنَّ] حرف مشبّہ بالفعل ہے جس سے پہلے ایک " باء " محذوف ہے جو فعل " لبشّر " کے بعد آتی ہے یعنی دراصل یہ " باَنَّ " ہی ہے۔
[لھم] جار (لِ) اور مجرور (ھم) مل کر " اَنَّ " کی خبر مقدم کا کام دے رہا ہے اور [جناتٍ] اس (اَنَّ) کا اسم مؤخر ہے گویا دراصل عبارت " ان جناتٍ لھم " تھی۔ " لھم " کے مقدم ہونے سے اس میں " ان ہی کے لیے (ہیں) " کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے ۔ [تجری] فعل مضارع معروف صیغہ واحد مؤنث غائب ہے جس کی تانیث اس کے فاعل (جو آگے آرہا ہے) کی جمع تکسیر کی وجہ سے ہے۔[من تحتھا] جار مجرور [" مِنْ " جار + تحت ظرف مضاف مجرور + ھا ضمیر مجرور] مل کر فعل " تجری " سے متعلق ہے اور [الانھارُ] فعل " تجری " کا فاعل (لھذا) مرفوع ہے گویا اس عبارت کی سادہ نثر یوں بنتی ہے۔ " تجری الانھار من تحتھا " اور یہ پورا جملہ فعلیہ (تجری من تحتھا الانھار) لفظ " جناتٍ (نکرہ موصوفہ) کی صفت ہو کر محلاً منصوب ہے۔ (کیونکہ " جناتٍ " اسم " انّ " منصوب تھا) اگر صرف " تجری " کو

"جنات" کی صفت سمجھ لیا جائے تو ترجمہ ہو جائے گا "ایسے باغات جو بہتے ہیں" اور یہ بالکل غلط ہوگا۔ کیونکہ باغات نہیں بہتے بلکہ نہریں بہتی ہیں۔ پورے فقرے (تجری من تحتھا الانھار) کو "جنات" کی صفت ماننے سے ترجمہ ہوگا "ایسے باغات جو کہ بہتی ہیں (یا ہوں گی) ان کے نیچے نہریں" یعنی جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی یعنی ان میں پانی رواں ہوگا (دریا یا نہر نہیں بلکہ اس کا پانی بہتا ہے۔ مگر عربی اردو دونوں کے محاورے میں "بہنے" کے فعل کی نسبت دریا یا نہر کی طرف ہی کی جاتی ہے)۔ اس پورے لمبے جملے میں " الذین امنوا وعملوا الصالحات" تو فعل " بشر" کا پہلا مفعول (جس کو خوشخبری دی جائے) ہے اور " أن لھم جنات تجری من تحتھا الأنھار" پورا جملہ اس (لبشر) کا دوسرا مفعول (جس چیز کی خوشخبری دی جائے) ہے۔

(۲) کلما رزقوا منھا من ثمرۃٍ رزقًا

[کلّما] میں " ما" ظرفیہ بمعنی جب" ہے اور " کلّ" کا مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے " کلّ" بھی ظرفیت کے ساتھ منصوب (کُلَّ) ہوگیا ہے اور یہ پوری ترکیب (کُلَّما) ظرفِ زمان بمعنی شرط ہے یعنی "جب کبھی بھی" یا "جب بھی" کے معنی دیتا ہے۔ [رُزِقوا] فعل ماضی مجہول صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ جس میں ضمیر متصل " ھم" نائب فاعل کے لیے موجود ہے۔ [منھا] جار مجرور متعلق فعل (رُزِقوا) ہے یعنی "وہ دیے گئے یا ان کو دیا گیا اس میں سے" تاہم شرط کی بنا پر ترجمہ مستقبل کے ساتھ ہوگا۔ (شرط ماضی پر نہیں ہوتی)۔ یعنی "ان کو دیا جائے گا اس میں سے" ــــ اس (منھا) کی ضمیر مجرور (ھا) "جنات" کے لیے ہے۔ [من ثمرۃ] یہ جار (من) مجرور (ثمرۃٍ) مل کر سابقہ "منھا" کا بدل ہے اور بدل الاشتمال ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کہیں "اکلت من بستانک من الرمان شیئًا" (میں نے تیرے باغ میں سے انار میں سے کچھ کھایا) اس میں " من الرمان" " من بستانک" کا بدل الاشتمال

(رزقنا) "الذی" کے صلہ کا ہی ایک حصہ ہے جس میں ضمیر عائد محذوف ہے یعنی دراصل "مرزقناہ" ہے۔ [من قبل] من حرف الجر اور "قبل" ظرف ہے اور یہاں اس کا مضاف الیہ محذوف ہے اس لیے یہ ضمہ (ـُـ) پر مبنی رہ گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "پہلے بھی" ہوگا ـــ اور یہ جار مجرور (من قبل) فعل "رُزِقنا" سے متعلق ہے۔ اور یہ سارا جملہ (رزقنا من قبل) اسم موصول "الذی" کا صلہ ہے اور یہ صلہ موصول مل کر "ھذا" کی پوری خبر بنتا ہے۔ اس پورے جملہ اسمیہ (ھذا الذی رزقنا من قبل) کا لفظی ترجمہ ہوگا "یہ وہ ہے جو دیا گیا ہم کو پہلے بھی"۔

(۴) وَاُتوا بہ متشابھاً

[وَ] یہاں حالیہ بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں "وَ" کے بعد ایک "قَدْ" محذوف سمجھا جائے گا اور اس کا تعلق سابقہ جملے کے ساتھ ہوگا۔ یعنی وہ یہ بات کہیں گے (قالوا ..... مندرجہ بالا ۳) اس حالت میں کہ ان کو دیا جا چکا (اتوا) .... اور چاہیں تو اسے واو الاستیناف سمجھ لیں یعنی یہاں سے ایک نیا جملہ شروع ہو رہا ہے اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ صرف "اور" سے کیا جائے گا۔ [اُتُوا] فعل ماضی مجہول صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر مرفوع متصل "ھم" موجود ہے (آخری "و" کی شکل میں) جو نائب فاعل کا کام دے رہی ہے۔ [بہ] جار مجرور متعلق فعل "اُتُوا" ہے یعنی پہلے فعل "اتی یاتی" پر "بِ" لگا کر اسے متعدی بنایا گیا اور پھر متعدی سے مجہول بنایا گیا ہے ـــ ضرورت ہو تو اس "اتوا بہ" کی لغوی بحث اوپر دیکھ لیجئے یعنی ۲ : ۱۸ : ۱ (۸) میں ـــ "بہ" کی ضمیر مجرور "رزق" کے لیے ہے (جس کا "رُزِقنا" میں ذکر ہے)۔ یوں "اتوا بہ" کا ترجمہ بنتا ہے "ان کے سامنے لایا گیا وہ (رزق)" ـــــ

[متشابھا] حال ہے (نصب کی وجہ یہی ہے) یعنی "ملتا جلتا ہوا"

ہے۔ ترجمہ ہوگا "کسی پھل میں سے یا کوئی پھل" [رزقًا] یہ فعل " رزقوا " کا مفعول ثانی (لھذا) منصوب ہے (پہلا مفعول ضمیر نائب فاعل " ھم " تھی)۔ اس طرح "کلما رزقوا منھا من ثمرۃ رزقا" کا ترجمہ بنتا ہے "جب کبھی بھی وہ دئے جائیں گے (ان کو دی جائے گی) ان (باغات) میں سے (یعنی) کسی (قسم کے) پھل سے کچھ روزی یا غذاء ـــــ اور یہ بھی ممکن ہے کہ "رزقًا" کو مفعول لہٗ سمجھ لیا جائے۔ اس صورت میں عبارت کے آخری حصے کا ترجمہ ہوگا۔ " روزی یا غذا کی خاطر " اردو کے صرف ایک مترجم نے "رزقا" کو مفعول سمجھ کر ترجمہ "کسی پھل کی غذا" کیا ہے۔ بیشتر حضرات نے اسے مفعول لہٗ سمجھ کر ہی ترجمہ "کھانے کو" کے ساتھ کیا ہے۔ اور اگر یہاں " من ثمرۃ " (کچھ پھل) کا ذکر نہ ہوتا تو " رزقا " کو فعل " رزقوا " کا مفعول مطلق بھی سمجھا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہاں بات اب بھرپور روزی کی نہیں ہو رہی جو مفعول مطلق کا تقاضا تھا ـــــ اس پورے جملے (کلما رزقوا منھا من ثمرۃ) کو " جنات " کی صفت ثانیہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسے جملہ مستأنفہ (الگ جملہ) بھی قرار دیا جا سکتا ہے تاہم یہ ایک نامکمل جملہ ہے اس لیے کہ اس میں صرف شرط کا بیان ہوا ہے جواب شرط اس سے اگلے جملے میں ہے جس کے ساتھ مل کر یہ جملہ شرطیہ مکمل ہوگا ـــــ یعنی

(۳) قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل

[قالوا] فعل ماضی کا صیغہ مع ضمیر الفاعلین " ھم " ہے۔ مگر یہاں سے " کلما " والے جملے کا جواب شرط شروع ہو رہا ہے۔ اس لیے اس کا ترجمہ مستقبل کی طرح " تو کہیں گے " ہوگا۔ [ھذا] اسم اشارہ مبتدأ مرفوع ہے۔ [الذی] اسم موصول (ھذا) کی خبر ہے لھذا مرفوع ہے۔ جیسے کہیں "ھذا الرجلُ" [رزقنا] فعل ماضی مجہول صیغہ جمع متکلم ہے۔ جس میں ضمیر مرفوع متصل " نا " نائب فاعل کا کام دے رہی ہے۔ اور یہ جملہ فعلیہ

(رزقنا) "الذی" کے صلہ کا ہی ایک حصہ ہے جس میں ضمیر عائد محذوف ہے یعنی دراصل "من رزقناہ" ہے۔ [من قبل] من حرف الجر اور "قبل" ظرف ہے اور یہاں اس کا مضاف الیہ محذوف ہے اس لیے یہ ضمہ (ـُ) پر مبنی رہ گیا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ "پہلے بھی" ہوگا ۔ اور یہ جار مجرور (من قبل) فعل "رُزِقنا" سے متعلق ہے۔ اور یہ سارا جملہ (رزقنا من قبل) اسم موصول "الذی" کا صلہ ہے اور یہ صلہ موصول مل کر "ھذا" کی پوری خبر بنتا ہے۔ اس پورے جملہ اسمیہ (ھذا الذی رزقنا من قبل) کا لفظی ترجمہ ہوگا "یہ وہ ہے جو دیا گیا ہم کو پہلے بھی"۔

(۴) وَاُتوا بہ متشابھاً

[وَ] یہاں حالیہ بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں "وَ" کے بعد ایک "قَدْ" محذوف سمجھا جائے گا اور اس کا تعلق سابقہ جملے کے ساتھ ہوگا۔ یعنی وہ یہ بات کہیں گے (قالوا ..... مندرجہ بالا ۳) اس حالت میں کہ ان کو دیا جا چکا (اتوا) .... اور چاہیں تو اسے واو الاستیناف سمجھ لیں یعنی یہاں سے ایک نیا جملہ شروع ہو رہا ہے اس صورت میں اس کا اردو ترجمہ صرف "اور" سے کیا جائے گا۔ [اُتُوا] فعل ماضی مجہول صیغہ جمع مذکر غائب ہے جس میں ضمیر مرفوع متصل "ھم" موجود ہے (آخری "و" کی شکل میں) جو نائب فاعل کا کام دے رہی ہے۔ [بہ] جار مجرور متعلق فعل "اُتُوا" ہے یعنی پہلے فعل "اتی یاتی" پر "بِ" لگا کر اسے متعدی بنایا گیا اور پھر متعدی سے مجہول بنایا گیا ہے ـــ ضرورت ہو تو اس "اتوا بہ" کی لغوی بحث اوپر دیکھ لیجئے یعنی ۲ : ۱۸ : ۱ (۸) میں ۔ "بہ" کی ضمیر مجرور "رزق" کے لیے ہے (جس کا "رُزِقنا" میں ذکر ہے)۔ یوں "اتوا بہ" کا ترجمہ بنتا ہے "ان کے سامنے لایا گیا وہ (رزق)" ـــــ

[متشابھا] حال ہے (نصب کی وجہ یہی ہے) یعنی "ملتا جلتا ہوا"

یا اردو محاورے کے مطابق صرف "باہم ملتا جلتا" اس طرح اس جملہ (واتوابہ متشابھاً) کا ترجمہ بطور جملہ مستانفہ یوں ہوگا "اور ان کو لائے گئے (وہ دیئے گئے) وہ (رزق یا پھل) باہم ملتا جلتا"

(۵) ولھم فیھا ازواج مطھرۃٌ

[وَ] عاطفہ اور [لھم] جار مجرور مل کر خبر مقدم کا کام دے رہا ہے۔ ضمیر "ھم" کا مرجع "الذین امنوا......" ہے۔ [فیھا] یہ جار مجرور متعلق خبر (لھم) ہے اور اس میں ضمیر مجرور "ھا" "جنات" کے لیے ہے۔ [ازواجٌ] مبتدأ مؤخر (نکرہ) مرفوع ہے [مطھرۃ] "ازواج" کی صفت ہے چونکہ موصوف جمع مکسر ہے لہٰذا اس کی صفت بصیغہ واحد مؤنث آئی ہے۔ اس طرح اس جملے (ولھم فیھا ازواج مطھرۃ) کا ترجمہ ہوگا "اور ان کے لیے (ہونگی) ان (باغات) میں پاکیزہ بیویاں"۔ یہ جملہ "و" عاطفہ کے ذریعے اپنے سے سابقہ جملے پر عطف ہے۔

(۶) وھم فیھا خلدون

[وَ] عاطفہ اور [ھم] مبتدأ مرفوع ہے۔ [فیھا] جار مجرور متعلق خبر (جو آگے آرہی ہے) ہے یہاں بھی ضمیر "ھا" کا مرجع "جنات" ہی ہے۔ [خلدون] ھم کی خبر مرفوع ہے۔ علامتِ رفع آخری نونِ اعرابی سے پہلے آنے والی "و" ماقبل مضموم (ـُـو) ہے جو جمع مذکر سالم میں علامتِ رفع ہوتی ہے۔ یہ عبارت سادہ نثر میں "وھم خالدون فیھا" تھی جس میں فاصلہ آیت کی رعائت سے "خالدون" آخر پر لایا گیا ہے اور "فیھا" کے مقدم ہونے سے اس میں "اس ہی میں" کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا ہے۔

نوٹ: آپ نے دیکھا کہ یوں تو یہ آیت (زیرِ مطالعہ) قریباً چھ چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے جس کو علاماتِ وقف کے ذریعے (مثلاً وقفِ مطلق "ط" لگا کر)

اوّلاً تین بڑے جملوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یعنی پہلا جملہ "الانہار" پر دوسرا "متشابھًا" پر اور تیسرا "خالدون" پر ختم ہوتا ہے۔ پھر ان جملوں میں سے بعض آپس میں اس قدر مربوط ہیں (مثلاً شرط اور جواب شرط ہونے کی بنا پر۔ دیکھئے ۲ر مندرجہ بالا) کہ ان کے درمیان وقف کرنا درست نہیں۔ اس لیے وہاں علامتِ وقف ناجائز (لا) لگائی گئی ہے۔ علامات الوقف ہمیشہ عبارت کی ترکیب نحوی کے پیشِ نظر مقرر کی جاتی ہیں۔ اعراب اور ترکیبِ نحوی کے اختلاف کی بناء پر مختلف ملکوں کے علماء کے نزدیک وقف کی جگہوں اور علامتوں میں فرق بھی ہوتا ہے۔ ہم نے اوپر (شروع آیت میں) برصغیر کے حوالے سے یہ علامت درج کی ہیں۔ مگر جملوں کے علیحدہ علیحدہ اعراب میں بعض دوسرے امکانات بھی بیان ہوئے ہیں۔

۲ : ۱۸ : ۳ الرسم

وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لھم
جنت تجری من تحتھا الانھر۔ کلما رزقوا منھا
من ثمرۃ رزقا قالوا ھذا الذی رزقنا من قبل
واتوا بہ متشابھا۔ ولھم فیھا ازواج مطھرۃ وھم
فیھا خالدون ۝ ۲۵

زیرِ مطالعہ آیت (جو قریباً ۳۵ کلمات پر مشتمل ہے) کے بیشتر کلمات کا رسم عثمانی اور رسم املائی یکساں ہے صرف سات کلمات بلحاظ رسم عثمانی توجہ طلب ہیں یعنی "الصالحات، جنات، الانہار، کلما، متشابھًا، ازواج اور خالدون"۔ (یہاں ہم نے ان تمام کلمات کو رسم املائی کے مطابق ہی لکھا ہے تاکہ آپ کو ان کے رسم عثمانی کا فرق معلوم ہو جائے۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کے رسم پر بالتفصیل بات کرتے ہیں۔

● مندرجہ بالا کلمات میں سے چار کلمات یعنی "الصالحات، جنات، الانہار

اور خالــدون" تو رسمِ عثمانی میں بالاتفاق بحذف الف لکھے جاتے ہیں یعنی قرآن کریم میں ان کو ہمیشہ اور ہر جگہ "الصلحت"، "جنت"، "الانھر" اور "خلــدون" کی صورت میں لکھا جاتا ہے۔ نوٹ کیجئے "الصلحت" میں سے دو الف حذف ہوئے ہیں (ایک "ص" کے بعد دوسرا "ح" کے بعد)، "جنت" میں ایک الف ("ن" کے بعد) "الانھر" میں ایک الف ("ھ" کے بعد) اور "خلــدون" میں بھی ایک الف ("خ" کے بعد) حذف ہوا ہے۔

● ترکی، ایران اور چین کے مصاحف میں یہ چاروں کلمات باثبات الف یعنی رسم املائی کی طرح لکھنے کا رواج ہو گیا ہے جو متفقہ رسم عثمانی کی صریح خلاف ورزی ہے۔ برصغیر کے اکثر اہلِ علم کتّابِ مصاحف (مثلاً منشی ممتاز علی۔ دہلی ـــ محمد قاسم لدھیانوی اور میرزا محمد علی۔ بمبئی) نے ان چاروں کلمات کو بحذف الف ہی لکھا ہے (یعنی رسم عثمانی کے مطابق)۔

● آیت زیر مطالعہ کے دو کلمات "متشابھًا" اور "ازواج" میں الف (پہلے کلمہ میں "ش" کے بعد اور دوسرے کلمہ میں "و" کے بعد) کے حذف یا اثبات میں اختلاف ہے۔ الدانی نے المقنع میں یہاں حذفِ الف کی تصریح نہیں کی اور یہی وجہ ہے کہ لیبیا کے "مصحف الجماھیریہ" میں یہ دونوں کلمات باثبات الف (متشابھًا اور ازواج کی شکل میں)، لکھے گئے ہیں۔ ہمارے ہاں۔ برصغیر میں ـــ (مثلاً انجمن حمایت اسلام کے نسخہ میں)، بلکہ ترکی، ایران اور چین کے مصاحف میں بھی یہ دونوں کلمات باثبات الف ہی لکھے جاتے ہیں ـــ اس کے برعکس الدانی کے شاگرد ابوداؤد کی تصریح کی بنا پر عرب اور افریقی ممالک (ماسوائے لیبیا) کے مصاحف میں یہ کلمات بحذف الف لکھے جاتے ہیں (یعنی "متشبھا" اور "ازوج" کی صورت میں) گویا برصغیر کے مصاحف بلحاظ "رسم" بہت سی چیزوں میں

اہل لیبیا کے مصاحف کے موافق ہیں۔ اگرچہ وجہِ موافقت مختلف ہے۔ اہل لیبیا الدانی اور ابوداؤد میں اختلاف کی صورت میں "الدانی" کے قول کو ترجیح دیتے ہیں جب کہ عام عرب ممالک اس صورت میں ابوداؤد کے قول کو فائق سمجھتے ہیں۔ البتہ برصغیر کے مصاحف میں ترکی اور ایران کے مقابلے پر "رسم" کی اغلاط نسبتاً کم ہیں ۔۔۔ اور اہل لیبیا سے ان کی ۔ بعض کلمات میں موافقت غالباً محض اتفاق ہے۔[۲]

● ساتویں کلمہ (جیسا کلمات پر اوپر بات ہوئی ہے) "کُلَّمَا" کے رسمِ عثمانی کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ کلمہ قرآن کریم میں ہر جگہ موصول (یعنی "کُلَّ" اور "مَا" کو ملا کر) لکھا جاتا ہے۔ یہ لفظ مجموعی طور پر قرآن کریم میں سترہ دفعہ آیا ہے۔ ان میں سے صرف پانچ مقامات (النساء: ۹۱، الاعراف: ۳۸، ابراہیم: ۳۴، المومنون: ۴۴ اور الملک: ۸) پر اسے مقطوع (بصورت "کلَّ ما") لکھنے کا ذکر کتبِ رسم میں آیا ہے، بلکہ ان میں سے بھی متفق علیہ مقطوع تو صرف ایک جگہ (ابراہیم: ۳۴) ہے۔ باقی مقامات پر اسے مفعول یا موصول لکھنے میں اختلاف ہے[۳]۔ ان سب مقامات کی وضاحت اپنی اپنی جگہ ہو گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ

۲ : ۱۸ : ۴ الضبط

۱ے جس کا ذکر بعد کے مصنفین مثلاً صاحب "مورد الظمآن" نے کیا ہے۔ ابوداؤد کی کتاب "التنزیل فی ھجاء المصاحف" ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کے مندرجات کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ بعد کی تالیفات ہی ہیں خصوصاً مورد الظمآن للخراز (المتوفی ۷۱۸ھ) مثلاً ان دو کلمات کے حذف الف کا ذکر دیکھئے دلیل الحیران (شرح مورد الظمآن)، ص ۹۲ اور ص ۱۰۲

۲ے اس موضوع پر بالتفصیل بحث الفاتحہ: ۶ یعنی ۱: ۵: ۳ میں لفظ "الصراط" کے رسم کے ضمن میں ہو چکی ہے۔

۳ے دیکھئے دلیل الحیران للمارغنی ص ۹۶ - ۲۹۵ اور الشاطبی (العقیلہ) ص ۹۲

ضبط کے نمونوں میں عموماً یہ ترتیب ملحوظ رکھی جاتی ہے پہلے پاکستانی طریق ضبط لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد ایرانی اور ترکی ضبط (بالعموم ملتا جلتا ہے) اس کے بعد عرب ملکوں کا ضبط اور آخر پر افریقی ممالک کا ضبط بتایا جاتا ہے۔ افریقی ممالک میں ہمزۂ قطع (کی علامت قطع کو) کئی طریقوں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ مثلاً s ، E ، ٥ (گول زرد نقطہ) اور بعض افریقی ملکوں (مثلاً تونس اور لیبیا) میں عرب ملکوں کی طرح " ء " کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم نے افریقی ممالک کے ضبط میں زیادہ تر " E " کو ہی علامت قطع کے طور پر پیش کیا ہے۔ جن کلمات کا ضبط سب جگہ یکساں ہے۔ اسے صرف ایک دفعہ ہی لکھا گیا ہے۔ زیر مطالعہ آیت میں اختلافاتِ ضبط کو مندرجہ ذیل نمونوں کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔

وَبَشِّرِ ، بَشِّرِ / الَّذِيْنَ ، الَّذِينَ ، ٱلَّذِينَ ،
ٱلَّذِينَ / اٰمَنُوْا ، اٰمَنُوا ، ءَامَنُواْ ، Eآمَنُواْ /
وَعَمِلُوا ، عَمِلُوْا ، عَمِلُواْ / الصّٰلِحٰتِ ،
الصَّالِحَاتِ ، ٱلصَّٰلِحَٰتِ / اَنَّ ، اَنَّ ، أَنَّ /
لَهُمْ ، لَهُم / جَنّٰتٍ ، جَنَّٰتٍ ، جَنَّاتٍ /
تَجْرِيْ ، تَجْرِيْ ، تَجْرِي ، تَجْرِے / مِنْ ،
مِن ، مِن / تَحْتِهَا ، تَحْتِهَا / الْاَنْهٰرُ ،
ٱلْأَنْهَٰرُ ، أَلْأَنْهَارُ / كُلَّمَا ، كُلَّمَا /
رُزِقُوْا ، رُزِقُوا ، رُزِقُواْ ، رُزِقُواْ /
مِنْهَا ، مِنْهَا ، مِنْهَا / مِنْ ، مِن ، مِن /
ثَمَرَةٍ ، ثَمَرَةٍ / رِزْقًا ، رِزْقًا / قَالُوْا
قَالُوا ، قَالُواْ ، قَالُواْ / هٰذَا ، هَٰذَا ، هَذَا /

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

اسلامی معیشت میں سادگی اور کفایت شعاری کی اہمیت (۳)

—— ازقلم: ڈاکٹر امین اللہ وثیر ——

اصلاحِ معاشرہ کے ضمن میں حضورؐ کا عمل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب سادگی اور کفایت شعاری طبیعت کا جزو بن جائے تو طبیعت کا سلجھاؤ خود بخود انسانی زندگی کو سادہ اور پروقار بنا دیتا ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ"

(کسی آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اس کا تعلق نہ ہو)

یعنی ہر اُس چیز یا کام سے غرض نہ رکھے جو بے مقصد ہے اور نہ ہی جس کا دنیا اور آخرت میں کوئی فائدہ ہے۔ اس حدیث پاک میں جو مضمون بیان کیا گیا ہے اس نے مسلمانوں کو بیکار اقوال و افعال، فضول گفتگو، بیکار کھیل تماشے اور وقت کی بربادی سے منع کیا ہے تاکہ وہ ان فضولیات سے منہ موڑ کر اپنی صلاحیتوں کو بامعنی اور تعمیری کاموں میں صرف کریں۔ آپؐ کے صحابہ کرامؓ اور آپؐ کے خلفاءِ عظامؓ کی بھی یہی شان تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے منصبِ خلافت کی ذمّہ داریاں سنبھالنے کے بعد محض ایک متوسط درجے کے کنبے کی کم از کم ضروریات کے مطابق خزانۂ عامرہ سے وظیفہ لینے پر اکتفا کیا۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ بیت المال سے ایک عام مسلمان کی معمولی ضروریات سے زیادہ بارِ خلافت کا وظیفہ حاصل نہیں کرتے تھے۔ فرمایا: "میرے لیے بیت المال سے صرف اتنا لینا حلال ہے: دو جوڑے کپڑے، ایک سردیوں کے لیے اور ایک گرمیوں کے لیے، حج و عُمرہ کے لیے احرام اور قریش کے ایک عام آدمی کی معاش کے برابر اپنے اہل و عیال کے لیے اخراجات"۔

حضرت عثمانؓ کو خزانے سے لینے کی حاجت ہی نہیں تھی اور حضرت علی مرتضیٰؓ عام لنگر سے کھانا کھاتے تھے جو عام لوگوں کو ملتا وہی کھا لیتے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے۔

حضرت عمرؓ خلیفۂ ثانی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ شام سے ایک قاصد آیا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ امیر المومنین کے دسترخوان پر فقط جَو کی روٹی موجود ہے، اس نے پوچھا: آپ گیہوں کی روٹی کیوں تناول نہیں فرماتے؟ ارشاد ہوا: کیا ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی میسّر ہے؟ میں تو وہی کچھ کھاؤں گا جو ہر شخص کو بآسانی میسّر ہوگا اور جسے سب بآسانی کھا سکیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذہان و قلوب سے حرص و ہوا، حبِّ جاہ اور حبِّ مال کو جڑوں سے باہر نکال کر پھینک دیا اور معاشرہ کو سادگی اپنانے کا وہ عظیم الشان درس دیا جس کا مظاہرہ تاریخ میں یوں ہوا کہ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ فتح القدس کے وقت جب وہاں تشریف لے گئے تو نہایت سادہ وضع قطع میں تھے۔ آپؓ سے اچھا لباس زیب تن کرنے کی درخواست کی گئی تاکہ اغیار پر رعب پڑے تو آپ نے انکار کیا اور فرمایا:

"ہمارے لیے اسلام کا رعب کافی ہے۔"

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" میں لکھتے ہیں:

"یوں تو ہر شخص اپنے روپے، پیسے اور ذرائع آمدنی کو انفرادی ملکیت کی بنا پر اپنی راحت اور اپنے عیش پر صرف کرنے میں مختار و مجاز ہے لیکن اگر یہی اختیار و اجازت حدِّ اعتدال سے نکل کر اس غلط راہ پر پڑ جائے کہ عورتوں میں زیور کی کثرت، زیب و زینت کے لیے گراں قیمت کی اشیاء کی خریداری، فیشن کی دلدادگی اور مردوں میں اسراف و نمائش سے متعلق عام ضروریاتِ انسانی سے الگ خارج از اعتدال تفریحی اخراجات کا ایسا ہمہ گیر شوق و ذوق پیدا ہو جائے کہ قوم کی قوم اس میں مبتلا نظر آنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچ جائے کہ بازاروں میں عام حاجات کی اشیاء کے مقابلہ میں بناوٹی حُسن اور زیبائش کی اشیاء کا لین دین بڑھ جائے۔ اہلِ صنعت و حرفت کی نظر ان ہی امور کی دیدہ زیبی اور لطافت آفرینی میں محو اور مصروف ہو جائے، تجّار کی تجارت کا فروغ صرف اسی پر منحصر ہو کر رہ جائے، مردوں کی محنت کا ثمرۂ دولت اسی پر خرچ ہونے لگے اور عام ضروریات کی تجارت، خام اجناس کی زراعت اور رفاہِ عام کے سلسلہ کی صنعت و حرفت کساد بازاری کے نذر ہونے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس قوم کا اقتصادی جہاز گردابِ ہلاکت میں گھر چکا ہے اور آج نہیں تو کل اس کے لیے تخت کی جگہ تختہ اور زربفت و کمخواب کی جگہ ٹاٹ و پلاس بھی میسّر نہیں آئے گا۔"

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اس مسئلہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ تمدّن و معیشت کے فساد کی راہوں میں یہ بہت بڑی راہِ فساد ہے، لکھتے ہیں:

"اسی طرح تمدّن کی تباہی و ہلاکت کے امور میں سے یہ ہے کہ امّت کے مالدار، زیورات، لباس، مکانات، خورد و نوش اور عورتوں کے حسن و زیبائش وغیرہ کی باریک بینیوں اور دقیقہ سنجیوں میں مبتلا ہو جائیں اور حاجات و ضروریات سے زیادہ عیش و تنعّم کی زندگی میں مشغول و مُنہمک رہنے لگیں۔"

اور نتیجہ یہ نکلے کہ ——

"لوگوں پر اس کی وجہ سے سخت مصیبت آن پڑے اور آخر کار اس شہر یا ملک کا یہ ضرر آہستہ آہستہ ایک عضوِ اجتماعی سے دوسرے عضو میں سرایت کرتا جائے یہاں تک کہ تمام مخلوق ایک عام تباہی میں گرفتار ہو جائے۔"

"اور یہ مرض عجمی تمدّن پر چھایا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالےٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس مرض کا اس طرح علاج کریں کہ اس فاسد تمدّن کا مادہ ہی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے۔ اس لیے آپ نے دیکھا کہ اس تمدّن کی زیادہ تر بنیاد مردوں کو طرح طرح کے ریشمی اور حریری لباس کی نزاکت کے ذوق، گانے والی عورتوں کے شوق اور سونے کے زیورات کی (بہتات) اور چمک دمک کے عشق میں سونے کا سونے کے ساتھ کمی زیادتی کے لین دین پر قائم ہے۔ لہٰذا آپ نے ان باتوں کی اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کی ممانعت کر دی اور حکم دے دیا کہ اس مصنوعی اور تباہ کُن عیش پسندی کو ختم ہونا چاہیے اور سادہ زندگی کو اختیار کرنا چاہیے۔"

ایک جگہ شاہ صاحبؒ اہلِ فارس اور اہلِ روما کی عیاشانہ زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تاریخ شاہد ہے کہ اہلِ روما اور اہلِ فارس (ایران) میں ایک لمبی مدت تک حکومت رہی۔ انہوں نے اپنے دَور کے حالات کے مطابق تمدن کے لوازم اور رفاہیت (آرام پرستی) اور عیاشانہ زندگی میں غیر معمولی ترقی کی۔ آخرت کی یاد کو پسِ پشت ڈال کر اپنی دنیوی زندگی کو عیاشی کے ساتھ بسر کرنا اپنا نصب العین قرار دیا اور شیطان نے ان پر اپنا تسلّط جما لیا۔ اطرافِ عالم سے موجد

اور مخترع کھنچ کر وہاں چلے آئے اور زندگی کی لذتوں کے متعلق کئی ایک نئی چیزیں اور نئے طریقے دریافت کئے۔ تمام امراء اور سرمایہ دار عیش پرستی میں منہمک تھے اور اس بارے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے۔ ان کے متعلق یہاں تک مشہور ہے کہ ان عیش پرست اور خود پسند امراء میں جس کا کمربند ایک ہزار روپے سے کم قیمت کا ہوتا تھا، اسے حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر سرمایہ دار اور امیر کبیر کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس ایک شاندار محل ہو جس کے صحن کے سامنے باغ ہو۔ حمام وغیرہ جیسے لوازم اس میں موجود ہوں۔ اس کے دسترخوان پر الوانِ نعمت چنے جائیں۔ اور اس کی زرق برق پوشاک سب لوگوں میں نمایاں ہو۔ نیز اس کے پاس عمدہ نسل کے گھوڑوں اور راحت بخش گاڑیوں کی کمی نہ ہو۔ اور خدمت کے لیے لونڈیاں اور کمربستہ غلام حاضر باش رہا کریں۔"

شاہ صاحبؒ اپنے دور کے سلاطین اور والیانِ ریاست کی مثال دے کر اہلِ روما اور اہلِ فارس (ایران) کی حالت اس طرح سمجھاتے ہیں:

"عصرِ حاضر کے ملوک وسلاطین اور والیانِ ریاست کے ٹھاٹھ دیکھ کر تم ان کی عیاشیوں اور زندگی کے مرافق میں غلو اور حد سے بڑھنے کا اندازہ لگا سکتے ہو۔ عیش پرستی کا یہ طریقہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام تمدّن اور معاشرہ میں ایک لاعلاج روگ پیدا ہو گیا۔ دوسرے سب لوگ ان کی دیکھا دیکھی عیاشیوں پر مائل ہو گئے۔ کیونکہ یہ ایک سچّا مقولہ ہے ——

"النَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" یعنی عوام اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ رعیت کے ہر طبقہ میں اپنی حیثیت کے موافق عیاشی کا مرض پھیل گیا۔ اور اس نے وبائے عام کی صورت اختیار کر لی۔ اس عیاشی کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ قسم قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے۔ کیونکہ عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے لیے جس ساز و سامان کی ضرورت تھی اس کا حاصل ہونا بہت سی دولت خرچ کرنے کے بغیر ناممکن تھا۔ اس لیے ان ملوک و سلاطین نے اپنی رعیّت اور بیوپاریوں پر اور امراء نے اپنی اسامیوں پر بھاری بھاری لگان (ٹیکس) عائد کئے۔ اس حالت میں ان غریبوں کے لیے دو ہی راہیں تھیں، ایک تو یہ کہ بغاوت کا علم بلند کریں اور مسلّح

ہو کر مقابلہ کریں؟ ایسا کرنا تو ان کے امکان سے باہر تھا کیونکہ یہ لوگ بے سروسامان تھے۔ ان کے سامنے دوسرا راستہ یہ تھا کہ سلاطین اور سرمایہ داروں کی اطاعت سے منہ نہ موڑیں، چوپایوں اور گدھوں کی سی ذلیل زندگی بسر کریں۔ جن سے ان کی مرضی کے بغیر ہل چلانے اور کنویں سے پانی نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جن کی تھوڑی بہت پرورش یا غور و پرداخت صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ مالکوں کی اپنی اغراض ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔

بہرحال نچلے طبقہ کے لوگ اپنے عمّال اور اپنے آقاؤں کی خدمت میں اس قدر مشغول ہوتے تھے کہ ان کو اُخروی سعادت کی طرف متوجہ ہونے کی لمحہ بھر بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

اس عیاشانہ نظام (اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کی زندگی) کو قائم رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس قسم کے لوگ موجود ہوں جو ان کے لیے مختلف قسم کے کھانے تیار کریں، ان کے لیے مختلف طرح کے کپڑے اور زینت و آرائش کا سامان بنائیں اور ان کے لیے بڑے بڑے شاندار محلّات اور مکانات تعمیر کریں۔ لوگوں کی اکثر تعداد تو ان بے سُود اشغال میں مصروف ہو گئی تھی، اس لیے اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بہت سے ایسے ضروری ہُنر اور پیشے چھوڑ دیے جائیں جن کا ہونا اصل تمدّن کے لیے نہایت ضروری تھا۔

جن لوگوں کا امراء اور سرمایہ داروں سے تعلّق تھا ان کے دلوں میں بھی یہ شوق پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بھی ان سرمایہ داروں سے ملتی جلتی طرزِ معاشرت اختیار کریں۔ سب کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح حکومت سے وابستہ ہوں اور جس طرح بھی ممکن ہو حکومت کے خزانے سے کچھ پا کر اپنی زندگی بسر کریں۔ اس لیے اُن کی اکثریت نے تو سرکاری ملازمت کو ہی اپنا مقصد قرار دے لیا تھا اور اس ملازمت کو ہی منتہائے کمال سمجھتے تھے۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات نہ ہوتی تھی کہ حکومت کا نظام ٹھیک طور پر کام کرے اور تمدّن کو کسی بہتر معیار پر پرکھا جائے۔ ان کا نصب العین صرف جلبِ زر ہوتا تھا۔ ان میں بعض شعر گوئی کو اپنا پیشہ بنا لیتے تھے اور مدحیہ قصائد لکھ کر سرکاری خزانے کے لیے بارِ گراں ثابت ہوتے تھے۔ بعض لوگ زہد اور پارسائی کے دکھاوے سے حکومت، سرکاری ملازمتوں اور عام لوگوں سے نذرانے اور شکرانے وصول کرنے کا دام بچھاتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ جماعت بھی حکومت اور معاشرہ پر بوجھ

ڈالتی تھی۔ ملوک و سلاطین اور اربابِ اقتدار سے قرب حاصل کرنے اور طرح طرح سے اُن کی خوشامد اور چاپلوسی کرنے نے ایک ہمہ گیر وبا کی صورت اختیار کر لی تھی۔

خلاصہ یہ کہ جب یہ مرض اپنی انتہائی شدت کو پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ ان پر سخت ناراض ہوا اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت نے عوام کی حالتِ زار کو دیکھ کر یہ تقاضا کیا کہ (سرمایہ داری اور) عیاشی کے اس مرض کی بیخ کنی کی جائے۔

چنانچہ اس نے نبیٔ امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپؐ نے مذکورہ عیاشانہ زندگی کی قباحت اور برائی بیان فرمائی۔ سرمایہ دارانہ زندگی کے لوازمات سے پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ مثال کے طور پر ریشمی کپڑے پہننے، سونے چاندی کے برتن کھانے پینے کے کام میں لانے، مردوں کا عورتوں کی طرح اپنے آپ کو زیورات سے آراستہ کرنے، شاندار عمارتیں بنوانے اور پھر ان کی آرائش کے لیے رنگین پردے اور تصویریں لٹکانے کو ممنوع قرار دیا۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی امت اور اپنے پیروکاروں کو پہلے سے بتا دیا کہ آپؐ کا غلبہ (سرمایہ دار) سلاطین کی دولت و حکومت کے زوال کا باعث ہے اور آپؐ کی نبوّت کا مقصد کسریٰ اور قیصر (جیسے شہنشاہوں) کی سلطنتوں کو مٹا دینا ہے۔"

سادہ معاشرت کے سلسلے میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی پسندیدہ اور مرغوب چیزیں کھانے پینے سے اپنا ہاتھ کھینچ لے، یا اپنی مرضی اور ذوق کے لباس و پوشاک کی طرف دیکھنا چھوڑ دے اور کبھی کوئی بڑھیا کپڑا بدن کو نہ لگنے دے۔ یا زندگی کے حُسن و جمال اور نعمت ہائے خداوندی سے کنارہ کش ہو جائے۔

اس ضمن میں اسلام کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ حلال غذاؤں میں سے حسبِ مرضی کھاؤ پیو، جائز طریقے سے حاصل کردہ عمدہ لباس پہنو اور من پسند اشیاء کا استعمال کرو لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس میں اِسراف نہ ہو اور دل تفاخر اور استکبار سے پاک ہو۔ حضرت عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اجازت ہے خوب کھاؤ پیو، دوسروں پر صدقہ کرو اور پہنو بشرطیکہ اِسراف اور نیت میں فخر و استکبار نہ ہو۔"

اسلامی طرزِ معاشرت سادگی کے ساتھ نفاست سے عبارت ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو والی بنا کر یمن

کی طرف روانہ کیا تو فرمایا: "اے معاذ، دیکھنا عیش پسند زندگی سے بچنا اس لیے کہ اللہ کے بندے عیش پسندانہ زندگی نہیں گذارتے"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو عیش پسندانہ زندگی گذارنے سے منع فرمایا ہے اور سادگی سے زندگی بسر کرنے کی تعلیم دی ہے عیش پسندانہ زندگی سے مراد ایسا رہن سہن ہے جس میں اسراف اور فضول خرچی ہو اور تنعّم پایا جاتا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صفائی و پاکیزگی اور خوش لباسی کی ترغیب دی ہے اس کو تجمّل کہتے ہیں، تجمل اور تنعّم میں بڑا فرق ہے تجمّل خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آپ نیا لباس زیب تن فرماتے تو دعا فرماتے اور آپ کی دعا میں یہ الفاظ بھی ہوتے اَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَیَاتِیْ یعنی میں اپنی زندگی میں اس لباس سے تجمّل حاصل کروں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفود سے ملنے کے لیے تجمّل کا لباس پہنتے تھے۔ اگر تجمّل میں غلو کیا جائے تو تنعّم شروع ہو جاتا ہے اور اگر تجمّل میں کمی کی جائے تو راہبانہ زندگی کی ابتدا ہو جاتی ہے شریعت نے تجمل کی کوئی حد مقرر نہیں فرمائی بلکہ ہر شخص کے ضمیر پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کا تعین خود کرے لیکن اپنی چادر کے مطابق اپنے پاؤں پھیلائے۔ اپنے جامے سے باہر نہ ہو جائے۔

ایک حدیثِ نبوی جس کا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "کھاؤ پیو اور پہنو اور صدقہ دو جب تک تکبر اور اسراف کی آمیزش نہ ہو"، گویا تنعّم کی تفسیر ہے کہ کھانے، پینے، پہننے حتیٰ کہ صدقہ و خیرات میں بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہ کیا جائے اور ایسا طرزِ زندگی اور وضع قطع اختیار نہ کیا جائے جس میں تکبر یا ریا یا سمعہ کی آمیزش ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ بہت خوش پوش اور نفیس الطبع انسان تھے ان کا یہ قول امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے کہ:

"جو جی چاہے کھاؤ اور جو جی چاہے پہنو (جائز ہے) جب تک کہ دو باتیں نہ ہوں ایک اسراف اور دوسرے استکبار اور تفاخر"

اسی طرح سادگی کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان اپنی صورت و ہیئت اور لباس کے حسن

قبح سے بے پروا ہو کر میلا کچیلا، پراگندہ حال اور پراگندہ بال رہنا شروع کر دے اور پاکیزگی ستھرائی، صورت و لباس کو سنوارنے کی فکر اور اس میں جمال پسندی کو سادگی کے منافی خیال کرے۔ اس طرح کا طرزِ عمل اسلامی تعلیمات و ہدایات اور شریعت کے مزاج سے ناواقفی کی دلیل ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں فضول و بے جا تکلفات سے بچنے کی تعلیم دی ہے وہیں نفاست و نظافت اور مناسب زینت و آرائش سے بے فکری اور لاپروائی کو بھی سخت ناپسند کیا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائے تو آپؐ کی نظر ایک پراگندہ حال آدمی پر پڑی جس کے سر کے بال منتشر تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ کیا یہ آدمی کوئی ایسی چیز نہیں پا سکتا تھا جس سے اپنے سر کے بال ٹھیک کر لیتا۔ اسی مجلس میں آپ نے ایک اور آدمی کو دیکھا جو میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا تو ارشاد فرمایا:

"کیا اس کو کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی جس سے یہ اپنے کپڑے دھو کر صاف کر لیتا"

(مسند احمد، سنن نسائی)

مؤطا امام مالک میں روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک آدمی مسجد میں آیا اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بکھرے ہوئے اور بے تکے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اس کو اشارہ فرمایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو ٹھیک کر لے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور جب پھر لوٹ کر آیا تو آپؐ نے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ تم میں سے کوئی سر کے بال بکھرے ہوئے ایسی (وحشیانہ) صورت میں آئے کہ گویا وہ شیطان ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام رہنے سہنے، کھانے پینے اور لباس و پوشاک کے معاملے میں افراط و تفریط سے بچنے اور اعتدال کی راہ اپنانے کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یہی سادگی سے مطلوب و مقصود ہے۔ اس کا مدعا پاکیزگی اور نفاست اور ایک صاف ستھری معاشرت اور حسین زندگی سے گریز نہیں ہے، حسن و جمال تو بذاتِ خود ایک محبوب اور پسندیدہ ادا ہے جب تک کہ وہ عیش و

عشرت کے درجے تک نہ پہنچ جائے۔ اور تکبر اور خود ستائی کے اظہار کا ذریعہ نہ بنے۔

سورۃ الاعراف کی درج ذیل آیات ہمارے لیے دلیل و ھادی ہیں۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا ، (آیت نمبر ۲۶)

"اے اولادِ آدم ہم نے تمھارے لیے پوشاک جو تمھارے ستر کو ڈھانپے اور آرائش کے کپڑے نازل کیے"

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ، (آیت نمبر ۳۱)

(اے اولادِ آدم لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو مگر بے جا خرچ نہ کرو)

اس آیت سے بقدرِ استطاعت صاف ستھرا اچھا لباس اختیار کرنے کی فضیلت اور استحباب ثابت ہوتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ زیب و زینت کا معیار کیا ہے؟ تو اگرچہ متوسط درجے کی زندگی کے لیے کوئی ایک معیّن معیار مقرر کرنا مشکل ہے اور اس میں حالات کے تغیّر کے اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے لیکن اپنی قوم اور اپنے معاشرے کے عام معیار کو سامنے رکھ کر ہر صاحبِ دولت انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنی معاشرت اور طرزِ زندگی کا ایسا معیار اپنائے کہ وہ اپنی جائز تجمیل و تحسین کے ساتھ ساتھ اپنے غریب و مستحق اہلِ وطن کی خدمت اور انفاق فی سبیل اللہ کے ضمن میں آنے والے اپنے فرائض کو بھی ادا کر سکے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ، قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ (آیت نمبر ۳۲)

(آپ کہہ دیجیے کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری پاک چیزیں کھانے کی۔ کہہ دیجیے یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے ہیں دنیا کی زندگی میں اور خالص انہی کے واسطے ہوں گی قیامت کے دن)

مفسّرین نے اس کی تشریح میں کہا ہے کہ عالم کی تمام چیزیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ آدمی ان سے مناسب طریقے سے متمتع ہو اور اللہ تعالیٰ کی عبادت، وفاداری اور شکرگزاری میں مشغول ہو، اس اعتبار سے دنیا کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین مطیعین ہی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے سلسلے میں منقول ہے کہ دنیوی نعمتیں اس شان سے کہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف اہلِ ایمان کے لیے ہیں، جبکہ کفار کے حق میں اس دنیا کا تنعّم ان کے کفر و حق ناشناسی کی وجہ سے عذاب و وبال بن جائے گا۔

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں عمدہ لباس کے علاوہ زیب و زینت کی تمام اشیاء کو اس آیت کے مفہوم میں داخل کیا ہے خواہ ان کا تعلّق لباس کی نفاست، جسم کی نظافت گھر کی صفائی و آرائش سے ہو یا لذیذ کھانوں اور بہترین سواری سے بشرطیکہ شریعت میں وہ حرام نہ ہو۔

حضرت امام مالکؒ جو عمدہ لباس زیب تن کرنے میں مشہور تھے، ان سے کسی نے جب اسکا سبب پوچھا تو انہوں نے جواب میں اسی آیتِ کریمہ کا حوالہ دیا تھا۔

(جاری ہے)

بقیہ: عربی زبان کی اہمیت

تجارتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس وقت پاکستانی مزدوروں سے لے کر ہنرمند کاریگروں، انجینئروں، ڈاکٹروں اور ماہرین سمیت کام کرنے والوں کی ایک کثیر تعداد عرب ممالک میں کسبِ معاش کی غرض سے جاتی ہے۔ اگر یہ لوگ عربی زبان سیکھ کر عرب ممالک میں جائیں تو نہ صرف اپنے آجرین کے لئے زیادہ فائدہ مند ثابت ہو سکتے ہیں، بلکہ اپنے ملک کے غیر رسمی سفیروں کی حیثیت سے بھی بہت اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں۔

ان جُملہ امور کی بنا پر، جن کا میں نے مختصراً تذکرہ کیا ہے، ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ عربی زبان و ادب سے لگاؤ پیدا کرے اور اس کی تحصیل و تکمیل میں اپنی پوری پوری کوشش صرف کرے۔ ❖❖❖

رجوع الی القرآن کی تحریک

کو آگے بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیجئے!

مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کی سرگرمیوں کا اجمالی تعارف اور

دعوتِ شمولیت

از قلم: سراج الحق سیّد (ناظم اعلیٰ)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، خدمتِ قرآنی کا ایک ادارہ ہے تاہم اسے عام معنوں میں محض ایک ادارہ سمجھنا درست نہ ہوگا بلکہ درحقیقت یہ ایک تحریک ہے۔ رجوع الی القرآن کی تحریک۔ لوگوں کو قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی جانب متوجہ کرنے کی تحریک!۔

مرکزی انجمن کا قیام آج سے قریباً ۱۹ برس قبل ۱۹۷۲ء میں عمل میں آیا۔ الحمدللہ اس وقت سے انجمن اپنے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دروسِ قرآن اور خطابات و تقاریر کے ذریعے لوگوں کو اور بالخصوص پڑھے لکھے نوجوانوں کو قرآن حکیم کی تعلیمات اور اس کے حِکَم و معارف کی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ اس حوالے سے انجمن نہ صرف انہیں ان کی دینی ذمہ داریاں یاد دلا رہی ہے بلکہ انہیں دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر آمادۂ عمل کرنے کی کوشش بھی کر رہی ہے۔

اپنے اس مشن کو پورا کرنے کے لئے مرکزی انجمن کے مختلف شعبہ جات اور پراجیکٹس، مکتبہ، اکیڈمک ونگ، ناظرہ و حفظِ قرآن، قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم سرگرم عمل ہیں۔ ان کے دائرہ کار مختلف ہیں مگر اپنی اپنی نہج پر یہ سب دعوت رجوع الی القرآن کے مشن کی تکمیل کے لئے ہی کوشاں ہیں۔ ان میں سے قرآن کالج اور قرآن آڈیٹوریم خصوصیت سے آپ کی توجہ چاہتے ہیں۔

۱۔ قرآن کالج

اس اہم تعلیمی منصوبے کا آغاز ۱۹۸۷ء سے کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے ۱۹۸۵ء میں قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر نیو گارڈن ٹاؤن کے اتاترک بلاک میں ساڑھے پانچ کنال کا ایک پلاٹ حاصل کر لیا گیا تھا۔ کالج کی تعمیر کے بعد پہلے جو تعلیمی و تدریسی کام اکیڈمی کے ذمہ تھا اب قرآن کالج کو منتقل ہو چکا ہے۔ ابتداء میں صرف B.A. کی کلاسیں شروع کی گئی تھیں جس کے لئے دو سال کی جگہ تین سال کا عرصہ متعین کیا گیا ہے۔ اس اضافی سال میں عربی اور ایک جامع دینی نصاب پڑھایا جاتا ہے اور بقیہ دو سال میں B.A. کے مضامین۔ ۱۹۸۹ء سے F.A. کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئیں۔ F.A. میں داخلہ لینے والوں کے لئے B.A. تک کا کورس جس میں دینی نصاب بھی شامل ہے، پانچ سال میں مکمل کروا دیا جاتا ہے۔

بہرحال انجمن کا زور (thrust) اس ایک سالہ دینی تعلیم پر مشتمل تدریسی کورس پر ہے جس کا اجراء ۱۹۸۸ء میں کیا گیا تھا۔ یہ کورس بنیادی طور پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے ڈگری یافتہ افراد کے لئے تشکیل دیا گیا ہے۔ ایک سال کے عرصے میں ان طلبہ کو عربی گرامر کی ٹھوس تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے کم و بیش تین پاروں کا ترجمہ مع مختصر تشریح، قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی پر مشتمل مقاماتِ قرآنِ حکیم کا ایک منتخب نصاب، احادیث نبوی کا ایک مختصر انتخاب اور تجوید کے بنیادی قواعد پڑھائے جاتے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس کورس کے فارغ التحصیل طلبہ میں سے ہی ایسے نوجوان نکلیں گے جو اپنی آئندہ زندگی میں قرآن حکیم کی حکمت کو عام کرنے کے لئے اپنا وقت نکالیں گے اور اپنی توانائیاں صرف کریں گے۔ ہم خصوصیت سے یہ امید کرتے ہیں کہ دین و دنیا کی تعلیم کے اس امتزاج کے ساتھ یہ لوگ قرآن مجید کی حکمت کو موجودہ زمانہ کی اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں گے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر امتِ مسلمہ کو معاشرتی، معاشی اور دیگر میدانوں میں آج کل جو مسائل درپیش ہیں، ان کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کر سکیں گے۔

دینی تعلیم کے اس ایک سالہ کورس کی جانب احباب و رفقاء کا رجوع بہت اطمینان بخش ہے۔ پہلے سال ۲۲ طلبہ نے اس کورس سے استفادہ کیا جن میں بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی شامل تھے۔ دوسرے سال اس سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد ۲۰ تھی۔

تیسرے سال کورس کے شرکاء کی تعداد ۱۴ تھی اور سالِ رواں کے دوران ۲۲ طلبہ اس کورس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

خط و کتابت کورس: ۱۹۸۷ء کے اواخر میں قرآن حکیم کی فکری اور عملی رہنمائی کے زیرِ عنوان ایک خط و کتابت کورس کا آغاز کیا گیا تھا۔ الحمدللہ یہ کورس نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ ۱۹۹۰ء کے دوران تقریباً ۵۰۰ طلبہ نے یہ کورس شروع کیا۔ اس کورس کے لئے کتب اور کیسٹس کی قیمت =/۱۰۰۰ روپے فی طالب علم آتی ہے مگر ہر طالب علم سے صرف ۴۰۰ روپے لئے جاتے ہیں' ۶۰۰ روپے انجمن خود برداشت کرتی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آخر میں "عربی گرامر" خط و کتابت کورس بھی شروع کیا گیا اور اس میں مئی ۹۱ء تک ۱۵۰ طلبہ داخلہ لے چکے ہیں۔

۲۔ قرآن آڈیٹوریم

ارکان انجمن بخوبی جانتے ہیں کہ انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کی بیشتر توانائیاں برسہا برس سے قرآن حکیم کے درس و تدریس میں صرف ہو رہی ہیں۔ اپنے انتہائی دل نشیں انداز اور منفرد اسلوب میں وہ لاکھوں لوگوں کو قرآن حکیم کے عملی پیغام کی طرف متوجہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے مخصوص انداز میں از اول تا آخر تسلسل کے ساتھ پورے قرآن حکیم کا درس آڈیو اور وڈیو ٹیپ پر ریکارڈ کروا دیں' اور یہ ریکارڈنگ اعلیٰ ترین فنی سطح پر کی جائے۔ ہمیں اندازہ تھا کہ اس کے لئے نہ صرف عمدہ Technical Equipment درکار ہوگا بلکہ یہ ریکارڈنگ بھی کسی بند اسٹوڈیو کی بجائے ایک معیاری آڈیٹوریم میں ہونی چاہئے جہاں حاضرین کی موجودگی میں یہ درس قرآن ہر ہفتہ دو یا تین بار باقاعدگی سے منعقد کیا جائے۔ بفضلہ تعالیٰ آڈیٹوریم کی عمارت اور اس کی Finishing اور Furnishing کا کام مکمل ہو چکا ہے۔ ایئر کنڈیشننگ کا کام ہو رہا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ جلد ہی مکمل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال رہی تو ہمارا ارادہ ہے کہ ۱۹۹۱ء کے وسط تک مجوزہ درس قرآن کا آغاز کر دیا جائے۔

ہم اس پر پورے طور پر مطمئن ہیں کہ مرکزی انجمن کی دعوت رجوع الی القرآن موجودہ زمانہ میں امت مسلمہ کی اہم ترین ضرورت ہے اور ہم اپنی بساط کے مطابق اس

جدوجہد میں مشغول ہیں۔ آیئے آپ بھی آگے بڑھیے اور اس اعلیٰ مشن کی تکمیل میں ہمارا ہاتھ بٹایئے۔ مرکزی انجمن کے مشن کی اعانت کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ انجمن کے رکن بن جائیں۔ انجمن کی رکنیت تین نوع کی ہے اور مندرجہ ذیل یکمشت اور ماہانہ اعانتوں پر مبنی ہے۔

محسنین یکمشت دس ہزار روپے	دو سو روپے ماہانہ
مستقل ارکان یکمشت پانچ ہزار روپے	سو روپے ماہانہ
عام ارکان ----------	پچاس روپے ماہانہ

رکنیت اختیار کرنے پر آپ انجمن کی کارکردگی سے ان شاء اللہ باقاعدگی سے باخبر رہیں گے۔ ہمارے اجتماعات میں شریک ہوں گے' ہمیں اپنے مشوروں سے نوازیں گے اور انجمن کو جو وسائل درکار ہیں' انہیں مہیا کرنے میں دامے درمے سخنے ہمارے مددگار ہوں گے۔ جزاک اللہ۔

رکنیت کا فارم ہم اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں' اسے پُر فرما کر ارسال فرما دیں۔

بقیہ : لُغات و اعرابِ قرآن

اَلَّذِیْ ، اَلَّذِیْ ، اَلَّذِیْ ، اَلَّذِیْ / رُزِقْنَا ، رُزِقْنَا ، رُزِقْنَا / مِنْ (مثل سابق) / قَبْلُ ، قَبْلُ / وَاُلُوْا ، اُلُوْا ، اُتُوْا ، اُتُوْا ، اُتُوْا / بِهٖ ، بِهٖ ، بِهٖ / مُتَشَابِهًا ، مُتَشَابِهًا ، مُتَشَابِهًا (بحذف الف) / وَلَهُمْ ، لَهُمْ / فِيْهَا ، فِيْهَا ، فِيْهَا ، فِيْهَا / اَزْوَاجٌ ، اَزْوَاجٌ ، اَزْوَاجٌ (بصورت حذف الف) / مُطَهَّرَةٌ ، مُطَهَّرَةٌ / وَهُمْ ، وَهُمْ / فِيْهَا (مثل سابق) / خٰلِدُوْنَ ، خٰلِدُوْنَ ، خٰلِدُوْنَ ، خٰلِدُوْنَ ۔

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاھور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۵۴۷۰۰- فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

درخواست رکنیت

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیمؒ

محترم اراکین مجلس منتظمہ ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں مسمّی / مسماۃ (مکمل نام مع ولدیت) ....

(پتہ) ....

....

.... فون نمبر ....

اپنے آپ کو مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے حلقۂ محسنین / مستقل ارکان / عام ارکان میں شمولیت کے لیے پیش کرتا ہوں / کرتی ہوں ۔

یکمشت زرِ تعاون ———— روپے بشکل نقد / چیک / ڈرافٹ نمبر ————

بنام ———— بنک لمیٹڈ ———— پیش خدمت ہے۔

مجھے انجمن کی قرارداد تاسیس واغراض ومقاصد سے مکمّل اتفاق ہے اور میں نے انجمن کے قواعد و ضوابط کا بھی مطالعہ کر لیا ہے۔

چنانچہ میں مبلغ ★ ———— روپے ماہانہ زرِ تعاون ادا کرتا رہوں گا / رہوں گی۔

مزید برآں انجمن کے اغراض ومقاصد کے لیے حتی المقدور عملی تعاون بھی پیش کرتا رہوں گا / کرتی رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ میرے اس انفاق کو قبول فرمائے اور مجھے اپنے دینِ متین کی بالعموم اور اپنی کتابِ عزیز کی بالخصوص خدمت کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) والسلام

تاریخ ---------- دستخط ----------

★ مؤسّسین ومحسنین انجمن کے لیے کم ازکم ماہانہ زرِ تعاون دو سو روپے ماہوار، مستقل ارکان کے لیے یکصد روپے ماہوار اور عام ارکان کے لیے پچاس روپے ماہوار ہے لیکن حسب استطاعت جتنا زیادہ دینا چاہیں وہ تحریر فرمادیں !

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے قواعد وضوابط کے چند اہم نکات

۱۔ انجمن کے مقاصد میں بنیادی مقصد لوگوں کو قرآن حکیم کی جانب متوجہ کرنا ہے۔ اسی سبب سے انجمن کے کام کو دعوت رجوع الی القرآن کا نام دیا گیا ہے۔

۲۔ اراکین انجمن کے تین حلقے ہیں۔ (i) حلقۂ محسنین۔ یعنی وہ لوگ جو رکنیت اختیار کرتے وقت یکمشت پانچ ہزار روپے ادا کرتے ہیں اور جن کا ماہانہ زرِ تعاون کم از کم ایک سو روپے ہوتا ہے۔ (ii) حلقہ مستقل ارکان۔ یعنی وہ لوگ جو رکنیت اختیار کرتے وقت یکمشت دو ہزار روپے ادا کرتے ہیں اور جن کا ماہانہ زرِ تعاون کم از کم پچاس روپے ہوتا ہے۔ (iii) حلقہ عام ارکان۔ یعنی وہ لوگ جو یکمشت کچھ ادا نہیں کرتے اور جن کا کم از کم ماہانہ زرِ تعاون پچیس روپے ہوتا ہے۔

۳۔ انجمن کی مجلسِ منتظمہ چودہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جس میں سے بارہ منتخب ہوتے ہیں اور دو نامزد۔

۴۔ مجلسِ منتظمہ کے منتخب ارکان میں سے چھ کو حلقۂ محسنین، دو کو حلقہ مستقل ارکان اور چار کو عام ارکان منتخب کرتے ہیں۔

۵۔ مجلسِ منتظمہ کے انتخاب کے لئے صرف ایسے وابستگان انجمن کے نام تجویز کئے جا سکتے ہیں جو (i) چالیس سال سے کم عمر کے نہ ہوں۔ (ii) انجمن سے وابستگی کا تین سال کا عرصہ مکمّل کر چکے ہوں (iii) نہ تو انجمن کے زیرِ کفالت ہوں اور نہ ہی انجمن میں کسی منفعت بخش عہدے پر فائز ہوں۔

۶۔ لاہور میں رہائش پذیر صرف وہ مرد وابستگانِ انجمن اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکتے ہیں جو سالانہ اجلاسِ عام میں موجود ہوں۔

۷۔ لاہور میں رہائش پذیر خواتین اور بیرونِ لاہور رہائش پذیر خواتین و حضرات بذریعہ ڈاک اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکتے ہیں۔

۸۔ انتخاب میں صرف وہ وابستگان انجمن حق رائے دہی استعمال کر سکیں گے جن کی انجمن سے وابستگی کو ایک سال کا عرصہ گزر چکا ہو۔

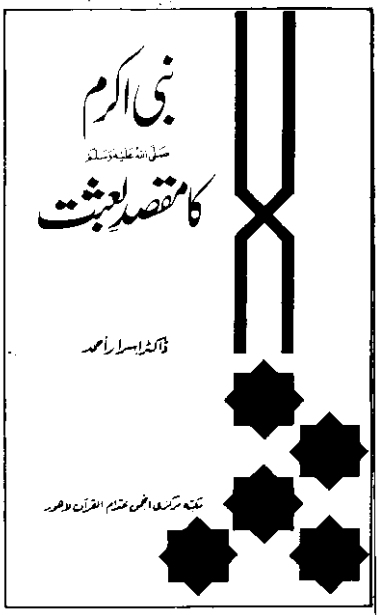

اشاعتِ خاص -/۲۰ روپے، عام -/۶ روپے

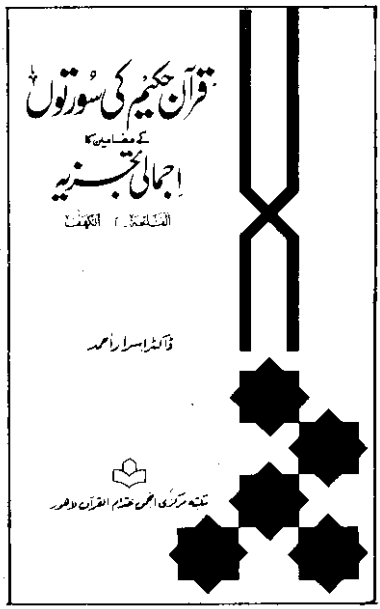

اشاعتِ خاص -/۴۰ روپے، عام -/۲۰ روپے

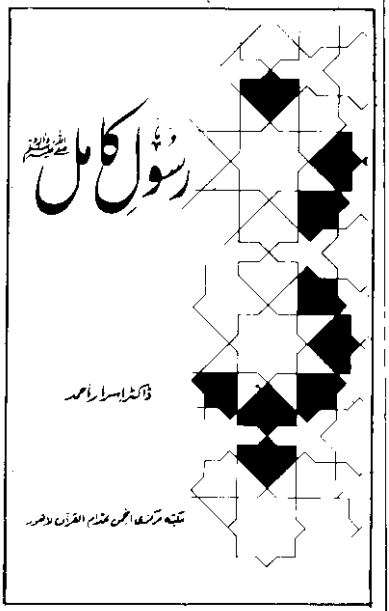

اشاعتِ خاص -/۱۲ روپے، عام -/۵ روپے

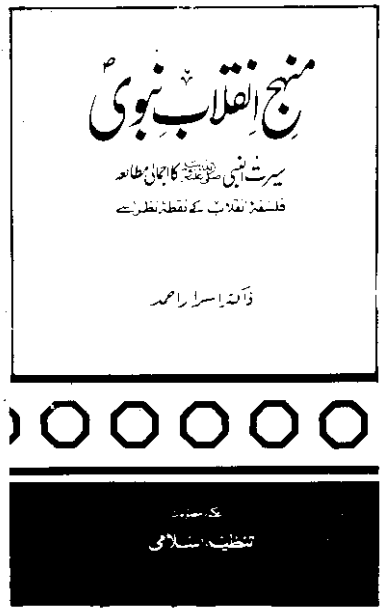

اشاعتِ خاص -/۶۰ روپے، عام -/۳۰ روپے

JUL 1991 Regd No. L. No. 8193

MONTHLY
HIKMAT_E_QURAN
LAHORE

VOL. 10
NO. 7

مرکزی انجمن خدام القرآن لاهور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان —— اور —— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے —— اور —— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ